Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

ادب منزل بمنزل

از

سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی

مصنفہ "شعلۂ کے ہیرو" "پاکستان کا معاشی پس منظر"
"ذکر و فکر" "یادیں اور خاکے" وغیرہ

مقدمہ

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی

اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

کراچی ـــــ ۱۹۶۶ء

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

(جملہ حقوق بحق کانفرنس اکیڈیمی محفوظ)

ناشر

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

متصل سرسید گرلس کالج ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

طبع اوّل۔ تعداد ایک ہزار ۱۹۶۶ء

قیمت Rs. [redacted] /80/-

مطبوعہ

جاوید پریس کراچی

Taj Tabir Foundation

Taj Tahir Foundation

انتساب

میں اس تصنیف کو اپنے مخدوم جناب قاضی افتخار علی
صاحب ایڈووکیٹ کراچی و سابق ایم۔ ایل۔ اے (سی پی)
کے نام پر معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتی ہوں۔
موصوف کا تعلیمی امور میں شغف اور ذوق علمی میرے
ناچیز تصنیفی کام کو ترقی پذیر بنانے میں ہمیشہ ممد رہا ہے

انیس فاطمہ بریلوی
کراچی ۲۰ اپریل ۱۹۶۶ء

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

فہرست مضامین

انتساب		۵
مقدمہ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۹
باب اوّل	کشفی اور روحانی ادب	۲۵
باب دوم	لافانی ادب	۳۷
باب سوم	دلّی میں اُردو	۴۸
باب چہارم	لکھنؤ میں اُردو	۵۵
باب پنجم	اُردو ادب پر انقلاب ۱۸۵۷ء کا اثر	۶۹
باب ششم	پنجاب میں اُردو	۹۹
باب ہفتم	علی گڈھ تحریک	۱۱۱
باب ہشتم	ڈپٹی نذیر احمد	۱۲۲
باب نہم	مولانا حالی	۱۲۷

Taj Tahir Foundation

باب دہم	علّامہ شبلی	۱۳۴
باب یازدہم	اکبر الہ آبادی	۱۴۱
باب دوازدہم	مولانا محمد علی جوہر	۱۴۹
باب سیزدہم	مولانا ظفر علی خاں	۱۶۰
باب چہاردہم	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۷۱
باب پنجدہم	علّامہ اقبال	۱۷۸
باب شانزدہم	مولانا طفیل احمد منگلوری	۱۸۷
باب ہفتدہم	ترقی پسند ادب	۱۹۰

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۷	۱۲	انڈس اور دریائے انڈس	انڈس اور دریائے انڈس
۳۶	۱	صرف انبیا کے لئے	صرف خواص کے لئے
۴۳	۱	نظر ہو گئی	نذر ہو گئی
۴۹	۱۵	کھینچنے	کھینے
۹۰	۱۷	دلربانہ یا	دلربایانہ
۱۴۵	۸	خردی	خرد
۱۵۳	۱۸	پژ مردی	پژ مردگی
۱۵۵	۱۰	سب دن میں	سب دن ہیں
۱۵۶	۱۴	نعرہ انا الحق	نعرہ حق
۱۵۷	۶،۷	لا تعداد ہاتھ بند قبا کھولنے کے لئے دراز ہو جاتے ہیں	لا تعداد ہاتھ آستین چڑھا لیتے ہیں
۱۶۴	۱۲	زانوئے تلمذ طے کر کے	زانوئے تلمذ تہ کر کے
۱۶۹	۱۴	پیٹتی جاتی ہے چھاتی	پیٹتی جاتی چھاتی ہے
۲۲۲	۸	اگر محبت و اتفاق	اگر بخت و اتفاق

Taj Tahir Foundation

مقدمہ

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی)
اُستاد شعبۂ انگریزی سندھ یونیورسٹی

زیرِ نظر تصنیف کی سب سے نمایاں اہمیت یہ ہے
کہ یہ ہمارے ادب کی "واحد خاتون نقّاد" کا کارنامہ
ہے، ہمارے یہاں خواتین نے ناول اور افسانے
کی طرف بڑی توجہ دی اور ان میں بڑی کامیابی
حاصل کی ہے مگر اُن چند خواتین کو چھوڑ کر جنہوں
نے اسناد حاصل کرنے کے لئے مقالے لکھے
میری نگاہ میں تو کوئی ایسی خاتون نہیں آئیں

Taj Tahir Foundation

جنہوں نے تنقید نگاری کی طرف ایسی مخصوص توجہ
دی ہو جیسی کہ سیّدہ انیس فاطمہ نے۔ اس لئے
اس تصنیف کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے
ہوئے مجھے ایک خاص قسم کی مسرّت ہو رہی ہے
خواتین کو ہمارے معاشرے میں ذہنی اور علمی
کاموں کے لئے کچھ کم ہی اہل سمجھا جاتا ہے، یہ
تصنیف اس بات کی تردید کرتی ہے کیوں کہ اس
میں اُردو ادب کے بارے میں وہ تمام مواد،
فراہم کیا گیا ہے جو ضروری تھا۔ اس کی تحلیل
کی گئی ہے اسے ترتیب دیا گیا ہے اور پھر ہر امر
پر صحیح اور غیر جانب دار رائے دی گئی ہے
یہ ایسا کام ہے جس سے خواتین عموماً اُلجھتی
ہیں مگر مصنفہ موصوفہ نے اسے کچھ ایسے صبر
اور استقلال سے پورا کیا ہے کہ ان کی تصنیف
آپ اپنی مثال ہو گئی ہے۔

دوسری بات جو اس تصنیف کو ہمارے
یہاں کی بیشتر تنقیدی کتابوں سے نمایاں
کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ہمیں تخلیقی
تنقید نظر آتی ہے۔ ہمارے یہاں علمی

Tai Tahir Foundation

تنقید کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر نگاہ اُٹھا کر دیکھا جائے تو طالب علموں اور اساتذہ کے مقالوں کے سوا اس وقت کی اُردو تنقید میں کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ یہ خشک اور غیر انفرادی چیزیں بیشتر منشی گیری کے درجہ پر اُتر آتی ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف ایک صاحبِ ذوق کا مطالعہ ہے۔ جن کو ادب کے علم کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی ہے۔ ان کی ایک مخصوص ہستی اور انفرادیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ادب سے لگاؤ پیدائشی ہے اور ماحول کے اثرات نے اس کو فروغ دیا ہے۔ انھیں اچھے اور بُرے ادب کی اسی طرح پرکھ ہے جیسے کہ اپنے داہنے اور اور بائیں ہاتھ کی اور اسی تمیز پر ٹیک لیتی ہوئی وہ اپنی رائیں نہایت آزادی کے ساتھ اور نہایت عمدہ زبان میں دیتی چلی جاتی ہیں۔ محترمہ کی اور بھی تصانیف سے میری نظر سے گزری ہیں جن میں اُنھوں

نے اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے
کچھ کردار تخلیق کئے ہیں اور جن سے ان کی
تخلیقی قوتوں کا پتہ لگتا ہے۔ یہی قوتیں زیرِ نظر
تصنیف میں ادبی مواد کے ساتھ ملکر ہمارے
ادب کی تخلیقی تنقید میں وہ اضافہ
کر رہی ہیں جو اگر نایاب نہیں تو کمیاب
ضرور ہے۔

تخلیقی صلاحیت کا ایک اہم ثبوت یہ
بھی ہے کہ "ادب منزل بمنزل" بظاہر
الگ الگ مضامین کا مجموعہ ہوتے ہوئے ایک
مکمل تصنیف بھی ہو گئی ہے۔ اسے ہم اگر
جدید اردو ادب کی تاریخ کہیں تو غلط نہ ہوگا
یہ امر اس کے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالتے
ہی واضح ہو جائے گا۔ تمام مضامین ہمارے
ادب کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو سرسیّد
اور حالی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں
کچھ ادبی مسائل زیرِ بحث آئے کچھ تحریکیں
چلیں اور زوردار افراد اُبھرے۔ چنانچہ
یہاں قریب قریب ہر اہم تحریک پر، ہر اہم

مسئلہ پر اور ہر عظیم فرد پر ہمیں ایک سیر
حاصل مضمون ملے گا۔ ادبی تاریخ لکھنے والوں
کا یہ روّیہ کہ وہ جتنے زیادہ نام گنا سکیں اتنا
ہی اچھا ہے۔ یہ اصول یہاں کارفرما نہیں
ہے اور نہ ہونا چاہیئے تھا۔ میں سمجھتا ہوں
کہ یہ نام گنانے والی تاریخیں منشی گری سے
آگے نہیں بڑھتیں۔ طلبا کو امتحان پاس
کرانے کے لئے وہ کتنی ہی مفید ہوں مگر عام
پڑھنے والوں اور غور کرنے والوں کے لئے
وہ ایک خشک فہرست سے زیادہ کچھ نہیں
رہ جاتیں برخلاف اس کے زیرِ نظر تصنیف
جدید ادب کی تاریخ کے ان پہلوؤں کو اخذ
کر کے سامنے لاتی ہے جو ہر طرح دلچسپ
ہیں اس لئے اگر میں اسے جدید اُردو ادب
کی تمام تاریخوں پر ترجیح دوں تو بے جا نہ
ہوگا مضامین ایسے عام مسائل سے شروع
ہوتے ہیں جیسے روحانی ادب، اور لافانی
ادب، اردو کے اہم مرکزوں پر جیسے دلّی۔
لکھنؤ اور پنجاب پر نظر ڈالتے ہیں، ۱۸۵۷ء

کے غدر یا انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں
علی گڈھ تحریک کے اثرات دکھاتے ہیں اور ہر
اہم ہستی جیسے سرسیّد۔ حالی۔ نذیر احمد۔ اکبر
الہ آبادی۔ اقبال پر سیر حاصل بحث کر کے ترقی
پسند تحریک پر ختم ہوتے ہیں، جدید اُردو کی
"ہائی لائیٹس" (High-lights) میں
اب کیا باقی رہ جاتا ہے۔ مضامین کے درمیان
ضمناً غیر اہم تحریکوں، مسائل اور افراد کے
بھی ذکر آگئے ہیں۔ کسی دور کی تاریخ لکھنے
کا یہ طریقہ عام طریقہ سے زیادہ اہم اس لئے ہے
کہ وہ ہماری توجہ کو محض تاریخی امور کے بجائے
خالص ادبی چیزوں پر مبذول کرتا ہے اور
صاحبان ذوق کے لئے زیادہ دل کش اور
مفید ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ بہر حال غیر
معروف لوگوں کے نام اور پتے بتانا تو تنقیدی
عمل نہیں ہوتا۔

غرض جدید ادبی دور کا جو جائزہ یہاں
پیش ہوا ہے اُسے جامع اور مانع کہا جا سکتا
ہے یا یوں کہیئے کہ جامع سے زیادہ یہ مانع ہے

Taj Tahir Foundation

یعنی اس کا تنقیدی معیار بلند ہے۔ پہلے مضمون میں "لے کامت دونوائے" کے قول سے شروع کر کے انسان کی ادبی جبلّت کا مفصّل اور، مدلّل جائزہ لیا گیا ہے یہاں ناقدہ کا نقطۂ نظر بھی صاف واضح ہو جاتا ہے وہ فرماتی ہیں :-

"مشیت چاہتی تھی کہ وہ اپنی ذکاوت و فراست کے سرچشمہ کا پورا رخ و ادراک کا کل اندوختہ اس ادب کی تخلیق پر صرف کرے جو بیمار انسانیت کے تن مردہ میں زندگی کی روح پھونکدے جس کا اعجاز یہ ہو کہ دکھے ہوئے پژمردہ دل خوشی و مسرت سے بھر جائیں اور ہر ایک شخص یہ باور کرنے پر مجبور رہو کہ زندگی کاملیت کی جانب بڑھتے رہنے کا نام ہے جو ایک منضبط موقعہ یا فلسفیانہ صداقت ہے۔"

یہاں ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ادب کو محض تفریح کا نہیں بلکہ انسانیت کی اصلاح کا اہم ذریعہ کہتی ہیں اور انسان کی ترقی اور کاملیت کی قائل ہیں۔ وہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو قدیم زمانے کی تاریکی سے باہر نہ آسکنے کی بنا پر نئی روشنی کو مطعون کریں۔ جدید دور کو وہ قدیم دور سے زیادہ ترقی یافتہ

ماننے کو تیار ہیں، مگر اس شرط کے ساتھ کہ۔

"ان کی وہبی اور اکتسابی قوت عمل اس امر کی مقتضی ہو کہ وہ اپنی تخلیقات خیر کے نصب العین پر رکھ کر انسانیت کے اعلیٰ اصولوں کی ترویج کریں"

ترقی کی راہ ان کے لیے کسی مادی نظریہ کو اپنانے اور اس کا پروپیگنڈا کرنے میں نہیں ہے بلکہ خیر کی راہ پر چلنے اور خیر کو زیادہ سے زیادہ رائج کرنے میں ہے یہ نظریہ ان کی تمام تنقید کا محرّک ہے اور اسی معیار سے جانچ کر وہ ادیبوں اور ادب پاروں کی آخری قیمت مقرر کرتی ہیں۔ قومی قدروں اور بدلتی ہوئی قدروں کے بجائے وہ دائمی قدروں کے موافق تنقید کرتی ہیں اور اس لیے عام مشہور نقّاد سے بہت آگے نکل جاتی ہیں۔

ان کے اس نظریہ کی سب سے زیادہ نمایاں مثال "ترقی پسند ادب" والے باب میں ملتی ہے وہ ترقی پسند ادب کے اہم نظریات اور عوامل کا جائزہ لیتی ہیں وہ اس ادب کے خلاف نہیں ہیں اور نہ اسکے فروغ دینے والوں کے نظریوں پر انھیں غصہ آتا ہے ان کا انداز مزاحیہ ہو جاتا ہے اور اس کے دائمی معیار سے گرا ہوتے پر ہنستی ہنساتی چلی جاتی ہیں کہ

"اس مرحلہ خاص پر ۱۹۳۲ء میں کچھ نوجوانوں کے ہاتھوں

انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ملک کے لئے نیک
فال تھا"

مگر اس سلسلے میں پریم چند کے قول کا جو اس انجمن کے
صدر تھے اقتباس پیش کرتی ہیں۔

"جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہوتا ہو،
روحانی تسکین مشکلات پر فتح پانے کے لئے
بجا استقلال نہ پیدا کرے اس پر ادب کا اطلاق
نہیں ہو سکتا"

ترقی پسند ادب پر اُس کے مخالفین اور موافقین دونوں
نے بہت کچھ لکھا ہے مگر یہاں ہمیں اس تحریک
پر شروع سے اب تک کے تمام مدارج کا بیان
اس مربوط طریقہ پر ملتا ہے کہ کہیں اور نظر
نہیں آتا۔ ترقی پسندی کے لیڈروں کے اقتباسات
قوت انتخاب کی داد مانگتے ہیں اور ساری تحریک
کی حقیقت عجیب لطیف مزاح کے ذریعہ کھل جاتی
ہے۔

یہ لطیف مزاح اور اسی قسم کے دوسرے جذباتی
تاثرات ہی ان کی تنقید کو منشی گری کے دائرہ سے
نکال کر تخلیقی تنقید کے دائرے میں لاتے ہیں غیر جانبداری

Taj Tahir Foundation

کو میتھو آرنلڈ نے تنقید کا سب سے اہم وصف بتایا ہے مگر ہمارے یہاں اس کے معنی یہ لئے گئے کہ نقّاد میکانیکی طریقہ پر چلے۔ اصل میں آرنلڈ خود بھی مصنفین کے متعلق اپنی رائے کا اظہار طنز وغیرہ کے ساتھ کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ انداز اپنی جگہ پر جائز ہے کہ نہیں۔ ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک مضحکہ خیز چیز سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے نقّاد غلو کے ساتھ اپنی سیاسی پارٹی کا پرچار کرنے آئے تھے اور جو ادبی مسائل روسی سیاست دانوں سے مستعار لائے تھے وہ کسی صحیح دماغ انسان کو یا تو غصہ دلاتے تھے یا ہنسی۔ بیدہ انیس فاطمہ کو نہ ان پر غصہ آیا ہے اور نہ ہنسی مگر جس لہجہ میں اُنھوں نے ان کے کارناموں کو بیان کیا ہے اور ان کے اقوال سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اس پر مسکرا دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً جدید ترین ترقی پسند شاہکار عبداللہ حسین کی "اداس نسلوں" پر وہ یوں لکھتی ہیں۔

"یہ لوگ بتاتے ہیں کہ لکھنے کے لئے کسی اہم داخلی یا خارجی سانحہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور

اگر بخت اور اتفاق سے سب خیریت رہے تو اُن کی
تخلیقی قوتیں جوں کی توں بیکار پڑی رہتی ہیں۔ مثلاً
ایک مصنف صاحب جن کی کتاب پر انھیں آدم جی
پرائز ملا ہے وہ ایک ماہ تک لاہور کے اسپتال
میں نروس بریک ڈاون، کے مرض میں مبتلا رہے
ان کا بیان ہے صحتیات ہو کر جب وہ وہاں سے
نکلے تو انھوں نے دو تاریخی کارنامے انجام دیئے
اپنی اس کتاب کا پہلا باب لکھا اور دوسرے
کسی سے محبت کی۔ سچ ہے آگ لینے جانا اور پیغمبری
مل جانا اسی کو کہتے ہیں"
اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہتیں مگر الفاظ سے یہ ظاہر
ہو جاتا ہے کہ ترقی پسند لوگ کس طرح اپنی کمزوریوں
کو اوصاف کی طرح بیان کرتے ہیں۔ اور اُنھیں یہ
خیال بھی نہیں گذرتا کہ دنیا کی نگاہوں میں وہ مضحکہ
بن رہے ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں "اردو"
کے باب میں اُنھوں نے غلو سے کام لیا ہے مگر یہ مبالغہ
بھی اپنی جگہ درست ہے کیونکہ لکھنؤ کا ادب کچھ ایسا
ہی تاثّر پیدا کرتا ہے۔
۱۸۵۷ء کے انقلاب اور علی گڈھ تحریک اور اسی

Taj Tahir Foundation

قسم کے ابواب میں سوشل تاریخ کے علم کا بہت اچھا
مظاہرہ ہوا ہے۔ ایک حد تک یہاں بھی محترمہ نے
علم سے زیادہ تجربہ پر سہارا لیا ہے۔ ان کے گھر والے
ہمیشہ ان تحریکوں میں سخنے۔ قدمے اور درمے شریک
رہے اور اس لئے انھیں ان کی اونچ نیچ کے دیکھنے کا
زیادہ اچھا موقع ملا۔ ان کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں
نے تحریکوں کو بھی عام درجہ پر لاکر انھیں دلچسپ
افسانہ بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ تحریک پر
مضمون خاص طور سے ہر پاکستانی کے لئے ضرور دلچسپ
ہونا چاہیئے کیونکہ یہاں پاکستان کی سرسید کے ہاتھوں
بنیاد پڑتی ہوئی دکھائی گئی ہے اور ان جزئیات کو
چھوڑ کر جن میں سیاسی مورخ اُلجھ جاتے ہیں سیدھا
سادھا قصہ اس بنیادی مسئلہ اور اس کے نشو و نما
کا بیان کر دیا گیا ہے جو آخر کار عملی جامہ پہن کر پاکستان
کی صورت میں نمایاں ہوا مگر سیاسی و سماجی حالات پر
وہ زیادہ نہیں ٹھہرتیں بلکہ فوراً ادبی اثرات کی طرف
رجوع ہو جاتی ہیں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جو
ادب کی خدمات کیں اُن کا جائزہ لیتی ہیں اور اس سے
وابستہ جن ادیبوں کا اُنھوں نے ذکر کیا ہے ان کو

ایک طرح پر اُن کا مہمان کہنا چاہیئے یہاں مولانا شبلی کی وہ خدمات سامنے لائی گئی ہیں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں شبلی سے وہ بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہیں اور شاید تمام جدید ادیبوں میں وہ ہی ان کے سب سے زیادہ مقبول ادیب ہیں۔

تصنیف کا بہترین حصہ میری رائے میں وہ ابواب ہیں جو الگ الگ افراد پر لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی تخلیقی تنقید اور انفرادی رائے زنی کے جوہر خواب کھلتے ہیں مثلاً سرسیّد کی بابت کہتی ہیں۔

"اُردو ادب میں سہل اور آسان الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو قاری کے ذہن نشین کر دینے کا ایک نیا اسلوب انھیں کا رائج کردہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگاری کا ملکہ قدرت نے انھیں وہبی طور پر عطا کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اگر وقوع پذیر نہ ہوتا اور ان کی سرگرمیاں صرف زبان و ادب ہی تک محدود رہتیں تو اُن کا شمار دنیا کے صف اول کے اہلِ قلم ادیبوں میں ہوتا۔

نذیر احمد کی بابت کہتی ہیں۔

"اُن کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ
تقریباً ایک صدی گذر جانے کے باوجود ہمارے
گھروں میں اب بھی وہی زبان بولی جاتی ہے اور
اس عہد کی تمدّنی و ثقافتی اقدار میں بہت کم
ردّوبدل ہوا ہے۔"

یا سیّد طفیل احمد منگلوری کی بابت کہتی ہیں۔

"مولانا نے نصف صدی تک اردو زبان کو جو سنجیدہ
اور فکری ادب دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
وہ صحیح معنی میں ایک مصلح اور ریفارمر تھے۔"

اسی طرح وہ جو کچھ آقبال کے سلسلہ میں کہتی ہیں اس کا
بھی بالکل نیا انداز ہے۔

"تاریخ کا ایک نیا باب آقبال سے شروع ہوتا ہے
حالی کے نالوں اور اکبر کے فکر میں ڈوبے ہوئے
طنز و مزاح کے تیر اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ عظمت
کی یادوں کے مزار پر بیٹھ کر آنسو بہانے کا وقت
گزر چکا ہے۔ دھند اور کہر میں لپٹے ہوئے ماضی کے
پیچھے اُفق کے اُس پار صبح کا روشن ستارہ فصلِ بہار
کی نوید لایا ہے شاعر کی آواز کی بازگشت فضاؤں میں
پھول بکھیر رہی ہے۔ یاس اور نا اُمیدی کا حصارِ تنگ

کائنات کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو گیا ہے طاغوتی
قوتیں لرزہ براندام ہوتی جاتی ہیں نئے عزم و حوصلہ
کے ساتھ ایک قوم منصۂ شہود پر ابھر رہی ہے۔ ان
سارے سلب شدہ حقوق کی واگذاشت کی ذمہ داری
اس نے اپنے اوپر لے لی ہے جو پوری دنیا کا مشترکہ
سرمایہ ہیں کسی ایک قوم کا نہیں۔"

ان تمام رایوں سے یہ فوراً محسوس ہوتا ہے کہ ناقدہ کوئی ٹکی بندھی بات نہیں کہہ رہی ہیں بلکہ اپنی انفرادی نظر سے ان ہستیوں کی بابت جن کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اظہارِ خیال کر رہی ہیں۔

نثری تصنیف کی حیثیت سے اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ تنقیدی کتابیں عام طور پر ایسی ہوتی ہیں جو بقول میری بیگم "حلق سے نہیں اُترتیں"، کم از کم ہماری عام مصلحانہ تنقید کا تو یہی حال ہے۔ مگر اس تصنیف کا کوئی باب ایسا نہیں ہے جو باوجود ٹھوس طریقہ پر تنقیدی ہونے کے افسانے کی طرح نہ پڑھ لیا جائے۔ زبان کی سلاست اور روانی اس بات کی خاص طور پر ضامن ہے۔ لہجہ میں نسائیت اور نزاکت ہے موضوع کے حساب سے زبان رنگ بدلتی ہے۔ کہیں

رنگ میں لطیف حسن آجاتا ہے کہیں عظمت اور کہیں طنز و مزاح کھیلنے لگتے ہیں تو کہیں درد و غم آنسوؤں کو دعوت دیتے ہیں وہ شبلی کی نثر سے خاص طور پر متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ مگر انھوں نے اپنا ایک الگ انداز پا لیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پر زور جملے اور اردو زبان کے مخصوص محاوروں کے استعمال سے ان کے طرز میں ایک خاص ادا پیدا ہو گئی ہے جو موضوع کی گرانی کو شیریں مقالی میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس تصنیف کو اردو ادب میں اس کا جائز مقام ملے گا اور یہ تنقید نگاری کو بھی ایک مقبول عام فن کی طرح رائج کرے گی۔

محمد احسن فاروقی

Taj Tamir Foundation

باب اوّل

کشفی اور روحانی ادب

مشہور مصنف اور مورخ "کامت دُونوائے (Lecomte Dunouy) رقمطراز ہے کہ :-

> حقیقی انسانی شخصیت اس لمحہ وجود میں آئی جب قوتِ گفتار نے نشوونما پانا شروع کیا۔ حیوانی شعور یعنی جبلّتوں کی جگہ ایک بہت ہی مختلف اور مخصوص طرز کے فہم نے لینی شروع کر دی۔[1]

دیگر حیوانات سے ممیّز کرنے والے دماغی عطیہ نے جس دادراک پر غیر معمولی اثر ڈالا اور وہ اس مہربان فطرت کے گن گانے میں مصروف ہو گیا جس نے دوسرے ذی حیات کے مقابلہ میں اسے یہ ترجیحی مقام تفویض کیا تھا

---

[1] "مقدر انسانی" صفحہ ۲۲۱ شائع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۵۸ء

چونکہ ابھی تحت الشعور کثافتوں سے پاک اور زندگی چند گنے چنے ضابطوں کا نام تھی جن کی پابندی جزا اور سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر کی جاتی۔ اور انسانی سرشت از خود نیکی کی طرف مائل تھی جیسی سیدھی سادھی زندگی تھی ویسے ہی سادہ خیالات تھے جو فطرت سے قریب تھے۔ لہذا انھیں کو اظہار بیان کا محوری نقطہ بنا لیا گیا تھا ابتدائی عہد کے انسان اپنے بھجن۔ طولانی نظمیں حسن ازل سے متاثر ہو کر تخلیق کرتے۔ حقیقی اور فطری شاعر کا یہ دور قیدِ تحریر سے آزاد ہونے کے باوجود ہزاروں سال تک چلتا رہا۔

ادب کی یہ پہلی اکائی تھی جو اشعار کی صورت میں دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔

دُنیا کے ماہرین لسانیات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اس وقت جس قدر بھی مروّجہ زبانیں ہیں ان کی شاعری۔ زور بیان اور حسن کاری کے لحاظ سے ان کے مقابلہ میں کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی ہے۔

ابتدائی عہد کا انسان صرف فطرت کے لئے جیتا تھا اسی لئے اسکی زندگی میں کسی درد اور دکھ کا اظہار نہ تھا کسی قسم کا خلا نہیں تھا۔ لاتعداد مدّ و جزر کے بعد اس نے کاملیت کی آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔ رنگا رنگ صحیفہ کائنات اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ کھلا پڑا ہے۔ گوش و ہوش کی جوہری توانائی نے اسے اس امر کا مجاز بنا دیا ہے کہ وہ اس سے جی بھر کر مستفید ہو سکے۔ فطرت قدم قدم پر اس کی دستگیری کر رہی ہے۔ پھر اگر وہ جی کھول کر اس کی تعریف میں رطب اللّسان ہے تو کیا بے جا ہے۔ دیکھئے کس عقیدت اور محبت سے خالق کون و مکان کے گیت

گائے جاتے ہیں۔ ایک بھجن کے الفاظ ملاحظہ ہوں

"زمین و آسمان کا بنانے والا
زندگی بخشنے والا وہی تو ہے
وہی وجۂ موت۔ وہی وجۂ حیات ہے
ہر طرف چھائے ہوئے ابر محیط،
پر بھی نظر رکھنے والا ہے، روشنی
اور ہوا کا اندازہ کرنے والا
وہی تو ہے جس کے آگے ہم جھکتے
اور نیاز چڑھاتے ہیں"

اُنھوں نے فطرت کو ایک حسین بچے سے تشبیہہ دے کر محبت و مودّت کے اس پر پھول نچھاور کئے ہیں۔ اور بھجن کے بول پڑھئے :-

"انڈس اور! دریائے انڈس
ہمارے کھیتوں کی خبر لے
ہم اس زمین پر اپنے دیوتاؤں کی مدد سے
بیٹھے ہیں"

رگِ وید جس کا زمانہ چار ہزار برس قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ ایک ہزار سی اوپر بھجن اور دس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ رگ کے معنیٰ حمد اور وید بمعنی

لہ سہیل علی گڈھ ۱۹۲۶ء

علم کے ہیں۔

ویدوں کے بعد آریہ ادب کی شوکت کا اظہار ان کی وہ نظمیں ہیں جو رامائن اور مہابھارت کی صورت میں دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ یہ جامع اور قدیم کتابیں کئی ہزار برس سے اپنا مقابل ڈھونڈھ رہی ہیں[1]

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی ہر ایک زبان کا ابتدائی سرمایہ نظموں پر مشتمل ہے ابتدائی عہد کے انسانوں کے سوچنے سمجھنے کا کیا انداز تھا۔ ان کی مزاجی کیفیت کیا تھی؟ وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے، ان سب باتوں سے روشناس ہونے کا ذریعہ یہی طولانی نظمیں ہیں۔

یونانی زبان کی ایلیڈ (ILLIED) میں سولہ ہزار اشعار ہیں اور لاطینی زبان میں ای ینڈ (ENIED) میں دس ہزار شعر ہیں

عرب دور جہالت کی شاعری ہزاروں سال بیت جانے کے باوجود ہنوز اپنے بلند مقام پر محفوظ بیٹھی ہوئی دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔

اسی لئے سارے علمائے لسانیات اس امر کے حق میں ہیں کہ:۔

"اوّلاً فطرت کا اتباع کرو لیکن یہ سمجھنے کے لئے فطرت کا اتباع کیوں کر کیا جائے قدما کا مطالعہ کرو کیونکہ وہ فطرت سے زیادہ قریب تھے، فطرت اور شاعری دو مختلف چیزیں نہیں تھیں[2]۔

---

[1] سہیلی علی گڈھ ۱۹۳۶ء

[2] نقد ادب ناشر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۸

مشہور مفکّر اور ادیب "روسو" رقمطراز ہے کہ :۔

"وہ فردوسِ ہوش و گوش زمانہ جب کہ انسان نہایت مطمئن۔ آزاد بے خوف اور صحت مند تھا۔ اگرچہ وہ وحشی تھا مگر شریف تھا"

پھر بڑے ہی درد بھرے الفاظ میں آرزو کرتا ہے کہ "کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آئے"، لیکن اب حالات دوسرا رُخ اختیار کر چکے تھے۔ کروڑوں برس کی فطرت اور انسان دونوں کی مشترکہ سعیٔ پیہم سے کرۂ ارض اس قابل بن گیا تھا کہ نسل انسانی اپنی تمدّنی اور عمرانی زندگی کا آغاز کر کے ارتقا کی آخری منزل تک پہنچ جائے۔ مشیت چاہتی تھی کہ انسان خود کو کامل بنانے کی جستجو اور خواہش کو دوسرے تمام افکار و آرا پر سبقت دے تاکہ اس کا وجود مجسّم کائنات کے حسن میں مزید اضافہ کا باعث ہو چنانچہ تمدنی زندگی کے پہلے مرحلے میں انفرادی زندگی چھوڑ کر اجتماعی طور پر رہنا سہنا شروع کرتا ہے۔

بہت سے لوگوں کے یکجا رہنے کے نتیجہ میں غذائی مسئلہ سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسان مجبور ہوتے ہیں کہ خاندانی ٹکڑیوں میں بٹ کر جنگل میں شکار کو نکلیں۔ جس جگہ شکار آسانی سے دستیاب ہوتا ہے وہیں رہنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری لکھتے ہیں کہ۔

"اجتماعی زندگی نے پیغام بھیجنے اور خیالات کو محفوظ کرنے کے لئے اُسے مجبور کیا کہ یہ کوئی چیز خط کی طرح کی ایجاد کرے یہی تمدّنی ضرورت ایجادِ خط

کی داعی ہوئی[1]

تصویریں سب سے پہلے اظہار خیال کا ذریعہ بنتی ہیں، محبت کے جذبہ کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ تو کبوتر کی تصویر بنادی جاتی ہے۔ دشمنی اور عداوت کے لئے سانپ کی، ہمیں پانچ چھ ہزار برس قبل مسیح کے تہذیب و تمدن کے آثار سے یہ امور معلوم ہوئے ہیں:۔

روایت و درایت کا وہ سلسلہ جس کو آئندہ باقاعدہ تاریخ بننا تھا۔ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ کاغذ کا کام پتھروں اور جانوروں کی کھالوں سے لیا جاتا تھا۔ ان کی رزم و بزم کی طویل داستانیں ان کے رہنے سہنے کے طور و طریق۔ ان کے طرز احساس کی نوعیت سمجھنے کے لئے ان کی سینہ بہ سینہ شاعری کے علاوہ ان چیزوں سے بھی ہمیں بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ دنیا کے ماہرین علم آلاثار نے تاریخ کے چھپے ہوئے پردوں سے ان کے علمی کارہائے نمایاں کو اُجاگر کرکے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسائل سے اُلجھے رہنا نوع انسانی کے مقدر میں لکھا تھا۔ تمدنی اور تہذیبی دور شروع ہوتے ہی لاتعداد مشکلات سامنے آکھڑی ہوئیں۔ شعور انسانی ایک اور گرداب بلا میں گرفتار ہوگیا تھا۔ تاریک راتوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے روشن ستارے طلوع سحر کی ہنگامہ آرائیاں بلند و بالا پہاڑ، مترنم آبشار، حسین لہلہاتی وادیاں، موسموں کا خوشگوار تغیر و تبدل، ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جس پر اسے غور و فکر کرنے کی فرصت ہو،

---

[1] خط و خطاطی۔ ناشر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۰ء

کیونکہ تہذیب کا لبادہ اوڑھ کر اُس نے فطرت کو چھوڑ کر انسانوں کے لئے جینا شروع کر دیا تھا، اس کو آئندہ اپنی اس نئی شخصیت کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی تھی کامت دونوائے کے الفاظ میں :۔

"خدا اور ابلیس کے درمیان کبھی ختم نہ ہونے والی
کشمکش شروع ہو چکی تھی جس کا مرکز و محور بنی آدم
تھا۔"

نسل انسانی کے تحت الشعور پر کثافتوں کی مسلسل تہ چڑھ چکی تھی رزم و بزم کی ہر ایک طولانی داستان اس صورت حال کا اعادہ کر رہی تھی اور وہ ان آویزشوں کا مظہر تھی جو آبادیوں کے درمیان تمدن نے پھیلا دی تھیں۔

دنیا کے سارے فلسفی، دانشور اور ماہرین علوم عقلیات اس معمہ کو حل کرنے میں ہنوز کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ جب انسان اپنے وجود کی علت غائی سے راز آشنا ہوا تو اُس نے چاہا کہ کاملیت کی جانب قدم بڑھا کر منشائے ایزدی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دے حضرت آدمؑ سے جو پہلی فرد گذاشت ہوئی تھی اس کا خمیازہ نوع انسانی کو بھگتنا لازمی تھا، شیطان کی جرأت رندانہ کا شکار جب عالم ملکوت کا باشندہ ہو سکتا تھا تو انسان کی کیا حقیقت تھی جس کی حیثیت زمین پر بھی نو وارد کی سی تھی۔ جبلی اور صوری دونوں لحاظ سے تاریخ کا یہ دور انسانیت کے لئے سخت آزمائش کا تھا۔ خیر و شر کی دو متضاد قوتیں اس کو اپنے قبضہ و اختیار میں لینے کے لئے برسر پیکار تھیں، ایک جانب خیر کی دیوی اپنے خوبصورت اور دل آویز بازو پھیلائے اس کو دعوت دے رہی تھی

کہ آؤ میری آغوش میں ابدی سکون اور مسرت حاصل کرو۔ میں ہی تو انسانیت کی وہ پناہ گاہوں جہاں محبت کی تقسیم چھوٹے اور بڑے یا کسی مسلک و مشرب کے نام پر نہیں ہوتی۔ میرے پیمانوں میں جو مئے ارغوانی بھری ہے اس کو پی کر آدمیت نے آداب خود آگاہی سیکھے ہیں۔ اس کی سرشت میرے خمیر سے بنی ہے جب تک اُس نے مجھے اپنائے رکھا امن و آشتی کی دیوی اس کے قدم چومتی رہی۔ تاریخ کا وہ عہد زریں مجھ سے شروع ہوتا ہے جب انسان اس مقام الوہیت پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے تذکرے زمین کی وسعتوں سے گزر کر آسمانوں میں ہونے لگتے ہیں، جب شیطان طاغوطیت کا لبادہ اوڑھ کر آبادیوں کو نفاق و شقاق کی آگ میں جھونک دیتا ہے، بھائی چارگی کے سارے بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے ہیں، اس وقت میں انسانیت کا پرچم لہرائے آگے بڑھتی ہوں۔ اور اس کو صراطِ مستقیم دکھاتی ہوں تاکہ وہ اس مقامِ محمود پر آسانی سے پہنچ جائے جو قضا و قدر نے اس کے لئے مختص کیا تھا۔ دوسری جانب شرّ آدمیت کو کھلی ہوئی دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ نخلِ آرزو کو کاٹ کر رکھ دینے والے لاتعداد آلہ ہائے آب دار اس کے پاس تھے جن کے ذریعہ وہ انسانیت کا سینہ فگار اور دامن تار تار کر دیتا ہے۔ جنگ و جدل اس کے جلو میں چلتے ہیں۔ اس کے تیشہ کا گھاؤ اس قدر گہرا ہوتا کہ صدیاں بیت جاتیں اور زخم مندمل نہ ہونے پاتا تھا اور کاروبار حیات کے ہر ایک شعبہ پر موت کی سی خامشی چھا جاتی تھی، تاریخ کا کوئی عہد ایسا نہیں گذرا جس میں خیر کے پیغامبر کو شر سے نبرد آزما ہونا نہ پڑا ہو۔ سقراط،

عیسیٰؑ۔ کنفیوشس۔ بدھ۔ زرتشت تا زلیسٹ اس کی مضبوط گرفت سے انسانیت کو بچانے کے لئے کوشاں رہے لیکن ان کا جو کچھ انجام ہوا وہ سامنے ہے۔ کسی کو زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگانا پڑا۔ کوئی تختۂ دار پر چڑھا کسی نے آبادیوں کو چھوڑ کر ویرانوں میں پناہ لی۔ لیکن اس کی رعد آسا للکار نے انسانوں کو بصیرت و بصارت سے اس طرح محروم کر دیا تھا کہ ان علم بردارانِ انسانیت کی آواز کی بازگشت انھیں دور و نزدیک کہیں سے بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

سوال یہ تھا کہ کیا فطرت اس پر آسانی سے راضی ہو جائے گی کہ کرۂ ارض پر اس کا واحد نمائندہ جس کو متنوع قسم کی صوری اور جبلّی خصوصیات سے مزین کر کے دنیا کی بادشاہت سپرد کی گئی تھی۔ رجعت قہقری اختیار کر کے دوبارہ حیوانیت کا جامہ پہن لے اور وہ شر کے پھیلائے ہوئے ہنگامۂ دار و گیر کا شکار ہو کر اس عظیم مقصد کو بھلا دے جو اس کی تخلیق کا باعث ہوا تھا۔

کامت دونوائے لکھتا ہے کہ:۔

"ہر وہ فعل جو بہیمیت کی طرف ارتجاع کا میلان رکھتا ہے اور ہر وہ خواہش جو ابن آدم کو محکوم بناتی ہے۔ منشائے ربانی کے خلاف اور شر مطلق ہے۔ برعکس اس کے ہر وہ شئے جو حیوان اور انسان کی درمیانی خلیج کو پاٹتی ہے اور ہر وہ فعل جو انسان کے روحانی ارتقا میں ممد ہے خیر ہے"[1]

---

[1] مقدر انسانی ص ۴۷۴ ناشر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی ۱۹۵۸ء

کائنات کا انقلابی ماحول ہر ثانیہ کسی ایسی علامت کی خبر دے رہا تھا جس میں انسان کو فطرت کا ہم آہنگ ہو کر فعّالی پارٹ ادا کرنا تھا۔

دوسرے ذی حیات کے مقابلے میں ذہانت و فطانت عقل و خرد سے معمور دماغی صلاحیت اور قوت گویائی نیز بھرپور اضافی قدریں اسی لئے تو اُسے عطا کی گئی تھیں کہ زندگی کا ملیت کی طرف بڑھے اور پوری کائنات پہ چھا جائے۔ شر عملِ ارتقا کی مخالفت کرتا ہے اور اس کی شخصیت سے اِعراض، خیر انسانی شخصیت کا احترام کرتی ہے۔

انسانی تاریخ کے اس نازک ترین مرحلہ پر تمام دنیا کے مذاہب نے جو وقیع خدمات انجام دی تھیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

اس کے لئے بے پناہ اظہار تشکر کے جذبات ہر ایک کے دل میں اُٹھتے رہیں گے۔ اُنھوں نے نہ صرف آسمانی کتابوں اور مواعظ حسنہ کے ذریعہ خیر کے اصولوں کی ترویج و اشاعت کی بلکہ جو ابدی اور روحانی روشنی پھیلائی اس کے نتائج بھی بڑے دور رس تھے۔ مذہبی ریفارمروں اور پیغمبروں نے بے شمار تکلیفیں اُٹھائیں اور اپنے مثالی کردار سے صفحۂ دہر پر جو نقوش مرتسم کئے ان کو کوئی دنیوی طاقت نہیں مٹا سکتی۔

مولانا سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ :-

"مذہب کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اس نے مساواتِ انسانی پر سب سے زیادہ زور دیا اور غریبوں کا مرتبہ بلند کیا۔ اس کی سرپرستی میں ایسے ادارے قائم

قائم ہوئے جن سے علوم وفنون کی ترقی ہوئی۔
بالخصوص علم طب نے بہت زیادہ ترقی کی تھی۔[1]

شر کی پھیلا ہوئی عفونت کے اس دور ضلالت و گمراہی میں خیر کی منادی سب سے زیادہ مذہبی مبلغین اور ان کے لٹریچر نے کی۔ دیوتاؤں کے لئے قربانی کے ساتھ وہ لوگوں کو امن سے رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ مریضوں کی خدمت کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ مجرد زندگی بسر کر کے اپنی ذات کو انسانی خدمت کے لئے وقف کر دینا لوازم حیات میں شامل تھا۔ انسان کا نیابتی منصب اس امر کا مقتضی تھا کہ وہ ان صفاتی اقدار کا حامل ہو۔ انھوں نے لوگوں کو تلقین کی کہ کائنات فطرت کے ایک دانش مندانہ اور شریفانہ منصوبہ کی تابع ہے اس لئے بنی آدم کا اولین فریضہ ہے کہ وہ خیر کے اصولوں کا پرچار کر کے منشائے ربانی کو پورا کرے، خیر کی راہ پر چلنے والوں کا دائرہ جس قدر وسیع ہوگا اسی قدر شر کا حلقہ تنگ ہوتا چلا جائے گا۔

ہزاروں سال تک مذہب تجدید و اصلاح کی ہر ایک تحریک کا علم بردار بنا رہا ہے لیکن وقت کا مدوجزر ایک نئے انقلاب کی نشاندہی کر رہا ہے۔ جامد نظریاتی مسلک و مشرب کا دور ختم ہو چکا ہے انسان کے ذہنی اور فکری ارتقاء سے فطرت مزید کام لینے پر مصر ہے۔ انسانی سرشت کے دو پہلو ہیں۔ ایک اخلاقی دوسرا ذہنی جو اس کی تمام جبلتوں پر حاوی ہے۔ بصیرت و بصارت کی وہ روشنی جو اب تک

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۶۱

صرف انبیا کے لئے مخصوص تھی عام کر دی جاتی ہے لیکن اس روشنی سے فیضیاب ہونے کے لئے بہت کم لوگوں کے نام قرعۂ فال نکلتا ہے۔ ذہانت و فطانت کے ساتھ شئے لطیف کا بھی ہونا اس کے لئے ضروری تھا۔ یہ لوگ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ رشد و ہدایت کا کام جاری رکھتے ہیں۔ ان کی وہبی اور اکتسابی قوتِ عمل اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات خیر کے نصب العین پر رکھ کر انسانیت کے اعلیٰ اصولوں کی ترویج کریں۔ مشیت چاہتی تھی کہ وہ اپنی ذکاوت و فراست کے سرچشمہ کا پورا ارخ حس و ادراک کا کُل اندوختہ اس ادب کی تخلیق پر صرف کریں جو بیمار انسانیت کے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونک دے۔ جس کا اعجاز یہ ہو کہ دکھے ہوئے پژمردہ دل خوشی و مسرت سے بھر جائیں اور ہر ایک شخص یہ باور کرنے پر مجبور ہو کہ زندگی کا ملیت کی جانب بڑھتے رہنے کا نام ہے جو ایک منضبط واقعہ یا فلسفیانہ حذاقت ہے۔

Taj Tahir Foundation

باب دوم

لافانی ادب

دنیا کے ہر ایک دور میں ادب کا کار منصبی یہ رہا کہ وہ ان تمام عقلی و روحانی جذبات اور دلائل و براہین کو مربوط کر کے انسان کو اپنی ذات کا علم حاصل کرنے میں مدد دے۔ ایسا ہی ادب فکری ادب کہلاتا ہے۔ اور ہر ایک زمانہ میں کام آتا ہے۔ اس کی جوہری توانائی پر وقت کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔ زندگی صحیح معنیٰ میں اُس وقت حسین کہلائے جانے کی مستحق ہوتی ہے جب کہ وہ کسی مُثبت مقصد کے لئے مصروف تگ و تاز ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ انسان کی فکری۔ ذہنی اور اخلاقی ترقی کے نتیجہ میں فنون لطیفہ میں ادب ہی ہے جس نے انسانوں کی مغلمی کے فرائض انجام دئے۔ اور انھیں صراطِ مستقیم پہ چلنے پر آمادہ کیا۔

مشہور ماہرِ نفسیات 'جے ایس راس' J.S.ROSS رقمطراز ہے کہ:-

"ذہنی ساخت، تجربہ اور کردار کا تعین نمایاں طور سے

کرتی ہے اور فرد کو یہ معلوم کرنے کی ترغیب
دیتی ہے کہ ماحول میں کس چیز پر توجہ دی
جائے"[1]

ایک مفکر لکھتا ہے کہ:-

"ہم ادب کو اس وقت حسین کہتے ہیں جب وہ
اپنے مدّعا کے حصول میں کامیاب ہو اور اس پر گہری
توجہ صرف کی گئی ہو"

سقراط کہتا ہے کہ:-

"پورا ادبی سرمایہ تین اعمال کا مرکّب ہے۔ اوّل ادبی
تخلیق۔ دوسرے اس کی تفہیم تیسرے اس کی تنقید"[2]

جو ادب مذکورہ بالا کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا ہے اُس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

دنیا کے سارے ادیب اور دانشور اس حکیم دانا کے ان ہر سہ کلیات پر اپنی ادبی تخلیقات کی اساس رکھتے آئے ہیں۔ یونانی فلسفیوں۔ مفکروں اور علمائے نقلیات نے اضاف ادب کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے جو کام کئے تھے ان کی مثال کوئی دوسری قوم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اُنھوں نے حیاتِ انسانی کو جو اس کائنات کا عظیم ترین مثبت واقعہ تھی سنوارنے اور جلا دینے کے لئے ادب کو فعّالی پارٹ ادا

---

[1] "تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ" نتائج کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۵۲ء

[2] "نقد ادب"

کرنے کے لئے تجویز کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ادب ان ساری بھرپور اقدار کو سرشت انسانی کا جزو بنانے میں ناکام ہے تو ان کی رائے میں وہ ادب نہیں بلکہ اس کی نقل یا کچھ اور ہے۔ ارسطو سب سے پہلا نقّادِ ادب ہے۔ جس نے دنیا کو بتایا کہ شاعری کی جوہری توانائی نثر میں بھی ہو سکتی ہے۔ فلسفۂ جمالیات کا بانی مبانی بھی ارسطو ہے۔ اس موضوع پر اس کا مقالہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی کتاب شعریات کو دنیائے ادب میں سب سے زیادہ بلند پایہ تصنیف مانا گیا ہے اس کے متعلق دنیا کے سارے اہل قلم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ:۔

"نظریاتِ ادب میں سب سے زیادہ منظّم اور سب سے پہلی کتاب ہے"

اس نے اپنی اس کتاب میں ان تمام اصولوں سے بحث کی ہے۔ جن کے ذریعہ وہ اصول مرتّب ہوتے ہیں جو ادب کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی کتاب "سیاست" اور افلاطون کی "ریپبلک" ابھی تک انسانی حقوق کی بنیادی دستاویز خیال کی جاتی ہیں۔

جہاں تک صنعتِ ادب کا تعلق ہے ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود ارسطو کے نظریات و استنباط پر ابھی تک کوئی اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ "مصنّف" "نقدِ ادب" رقمطراز ہے کہ:۔

"ارسطو کا احساس ضمیر ایک سچے اور عظیم المرتبت فلسفی کا احساس ضمیر تھا اسی لئے ادب کا موضوع محدود ہونے کے باوجود اس نے جو بحث کی ہے وہ واقعۃً فلسفہ ہے۔

ایک مفکّر کا قول ہے کہ :-

"زندگی کا آغاز خواہ کسی نقطۂ نظر سے کیا جائے لیکن
اس میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہنی چاہیئے"

ایک صالح ادب ہمیں مذکورۂ بالا راہ پر چلنے میں مدد دیتا ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک فنکار اپنی تخلیقات کس قسم کے حالات میں پیش کرتا ہے۔ اور کس حد تک اپنے دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ نیز اس میں کچھ باتیں ایسی سموئی ہوتی ہیں جس سے اس کے زمان و مکان کی پہچان ہو جاتی ہے۔ علاقائی اور آفاقی ادب کا یہی فرق اس کی قومی خصوصیات کا بھی مظہر ہوتا ہے۔

ایک مفکّر رقمطراز ہے کہ :-

"روایت نام ہے تاریخی تسلسل کا جس کی نشوونما
ہزاروں سال کی فکر و بصیرت پر ہوتی ہے، زبان کا آئی
سرمایہ وہ لٹریچر ہے جو اسلاف چھوڑ کر جاتے ہیں"

ایک مرکزی نقطۂ نظر انسان کی ساری جودت و جولانیٔ طبع کو اس طرح بروئے کار لے آتا ہے کہ اس کی ساری دبی ہوئی صلاحیتیں خودکار پرزوں کی طرح کام کرنے لگتی ہیں۔ راہ کی ہزار صعوبتیں اور دشواریاں خاطر میں نہیں آتیں۔ لیکن جنون کی وارفتگیوں اور جشر سامانیوں کے لئے کوئی کیسلئے اور محمل بھی تو ہو۔ یہ ساری کائنات گردشِ پیہم کی بدولت چل رہی ہے۔ اس کا ایک لمحہ کا جمود و سکون اس کے نظام کو درہم و برہم کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہی حال نوعِ انسانی کا ہے یہاں کا ہر ایک ہنگامہ اس کی زندگی کی علامت کی دلیل اور اس کے وجود کا سارا تنوع اس کی ساری افادیت اسی ایک

کلیہ پر مبنی ہے۔

جب انسان نتائج سے بے پرواہ ہو کر خود کو سمندر کی خونخوار موجوں کے حوالہ کر دیتا ہے۔ تب اس کی ذات۔ کشتی۔ بحر اور ساحل بیں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مقصدی ادب اس کے لئے فعّالی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی کی جلائی ہوئی شمع میں اس نے اپنے کام اور مقام کو پہچانا ہے اور اسی کے بنائے ہوئے زاویوں پر اپنی راہوں کا تعیّن کیا، یہی وہ آئینہ ہے جس میں اُس نے خود کو اور دوسروں کو پہچانا۔ دنیا کی لاتعداد قومیں ایسی ہیں جن کے سارے آثار و صنادید وقت کے بے رحم ہاتھوں نے مٹا ڈالے لیکن ان کا ادب اور چند لافانی کتابیں جب تک موجود ہیں ان کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ وقت کا دبیز پردہ ہر چیز کو لپیٹتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اعلیٰ ادب اس کی دسترس سے ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ تاریخ رزم و بزم کی لاتعداد داستانوں کو اس طرح اپنے دامن میں سمیٹے بیٹھی ہے کہ بکثرت قوموں کے وجود تک کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ بجز اس زندۂ جاوید ادب کے جو اُس نے چھوڑا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام اہلِ قلم اور ادیبوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے زیادہ حسین نصب العین سے ہی متاثر ہو کر اپنے فن کی تخلیق کی۔ وہ مسلّمہ اصول جو اُنھوں نے مدوّن کئے تھے آج تک جوں کے توں قائم ہیں۔ شیلے اور بائرن مشہور رومانی شاعر ہیں لیکن اس کے باوجود انسانی آزادی کے گیت گاتے رہے۔ اس کی اصلی وجہ ان کا مرکزی خیال تھا کہ ساری اقدار کا پیمانہ آدمی ہے۔ ایک یونانی فلسفی کے الفاظ ہیں۔

"ہماری ہر ایک اُمنگ اور ہر ایک عمل کا محور صرف

آدمی کو ہونا چاہیئے"

ہر ایک تحریک خواہ ادبی ہو یا سیاسی پہلے اس قوم کا بصیرت یافتہ طبقہ اس کے لئے سرگرم عمل ہوتا ہے۔

ٹیگور کے الفاظ ہیں :۔

"اس کا فرض ہونا چاہیئے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام پہنچائے اور کسی کو ناکارہ اور نا اُمید نہ ہونے دے[1]"

چیخوف کہتا ہے کہ :۔

"جن لوگوں کے سامنے واضح اور حقیقی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہوتا وہ سرابوں کے سہارے جینا شروع کر دیتے ہیں"

جب سے ادب کی داغ بیل پڑی اسی ایک کلیہ کی اساس پر ساری ادبی کاوشیں کی گئی ہیں۔ لیکن جب ادیبوں اور ان کا تخلیق کردہ ادب اس ڈگر سے ہٹا تو اُس نے اپنا بھرم کھو دیا۔ غیر مقصدی ادب کی مثال ان حشرات الارض کی سی ہے۔ جو موسم برشگال میں از خود پیدا ہوتے ہیں اور موسم کے گذرتے ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ ان کی غیر اہم ہستی کب عالم وجود میں آئی۔ اور کب

---

[1] "روشنائی" ٹیگور کا پیغام انجمن ترقی پسند کے نام۔

گردابِ فنا کی نظر ہوگئی اُس پر ایک لمحہ بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں یک حیاتیاتی اجزاء کا تعلق ہے حشرات الارض اور انسانوں کے درمیان بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ فنا کے عمل سے جب انسان دوچار ہوتا ہے تو فضا پر رنجوری اور مہجوری طاری ہو جاتی ہے۔ نوحے اور مرثیے لکھے جاتے ہیں۔ لیکن حشرات الارض پر کوئی دو آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوتا۔

کسی زبان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں مقصدی ادب کا فقدان ہو۔ تمام دانشور اور ادیب اس امر پر حیران اور سرگرداں ہیں کہ:۔

"کائنات مکمّل لیکن انسان غیر مکمّل ہے"

ادب کا کام یہ ہے کہ اس خلا کو پُر کرے۔ اور انسانیت کے دامن سے اس دھبّے کو دور کر کے اس کی کھوئی ہوئی عظمت واپس دلائے۔

ڈاکٹر ہیوگو لکھتا ہے کہ:۔

"دنیا کی ہر چیز لکھنے کے لئے ایک عنوان ہے لیکن
وہ کسی صاحبِ کمال کی منتظر ہوتی ہے، جو اس پر
قلم اُٹھائے[1]"

ایک اور مفکّر رقمطراز ہے:۔

"جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے بیان کیا جا سکتا ہے لیکن
ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اس کو بیان کرنا جانتا ہو"

---

[1] سہیل علی گڑھ۔

ایک ادیب اس وقت کامل الفن سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ انسانی نفسیات کے ساتھ کائنات کا بھی رمز شناس ہو۔ اس کا وجود فطرت اور انسان کے درمیان سنگم کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے خرد کے ناخنوں سے نہ صرف زمانۂ حال کی گرہیں کھولے بلکہ ماضی کے دبیز پردوں میں چھپے ہوئے کروروں برس کے تمدنی اور تہذیبی ورثوں سے دنیا کو روشناس کرائے جن کو دست بُردِ زمانہ تلف کر چکا ہے۔ ماضی۔ حال اور مستقبل ہر سہ اَدوار کے لئے اس کی اصابت رائے حکم کا درجہ رکھتی ہو۔ زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے لیکن اس کی تحریروں کی افادیت کبھی کم نہ ہو۔ صنفِ ادب میں وہ جو اضافہ کرے، جن موضوعات پہ قلم اُٹھائے اور اپنی غیر معمولی بصیرت سے جو نتائج اخذ کرے اُن تک ہر کہہ و مہ کا گذر نہ ہو۔ وہ ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے بلکہ ماحول اُس کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اس کی عظیم شخصیت اس مقام مخصوص پر تنہا کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس کو مشیت اُس کے لئے تجویز کر چکی ہے، ایسا انسان خواہ کسی خطۂ زمین پر پیدا ہو۔ کسی نسل و قوم سے تعلق رکھتا ہو اس کی ذاتِ ستودہ صفات دُنیائے انسانیت کا ایک مشترکہ سرمایہ خیال کی جاتی ہے۔ آدمیت کے اس مثالی کردار کو جنم دینے کے لئے کائنات ہزاروں سال تک مصروف کار رہتی ہے۔ فطرت اپنے بھرپور خزانوں کو بے دریغ لٹاتی ہے۔ تب کہیں جا کر ایک دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ کرۂ ارض آبادیوں سے معمور لیکن انسان کا وجود شئے عنقا۔ آدمیت کی جگہ خالی پڑی رہتی ہے۔ علاوہ بریں ادیب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ

اُس زبان پر مکمل عبور رکھتا ہو جس کو اُس نے ذریعہ اظہار بنایا ہو۔ یا جو اس کی قومی و ملّی زبان ہے۔ خوبصورت الفاظ۔ متنوّع تشبیہات اور استعارات کو مناسب طریقے سے استعمال کرنا جانتا ہو۔ دراصل کسی زبان کی خوبی اس کا طولانی حجم نہیں۔ بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ اس میں فکری اور مقصدی حصہ کس قدر ہے۔ اس کا طرز نگارش اور اسلوبِ بیان کس حد تک مؤثر اور دلکش ہے۔ وہ اپنے افکار و خیالات مانگے ہوئے تانے بانے سے تو نہیں بنتا۔ کیا زبان اس کی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بخوبی متحمل ہو سکتی ہے؟ دنیا کی ہر ایک زبان جب ہی معیاری کہلانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے جب کہ ادب کی کوئی بھی صنف اس کی دسترس سے باہر نہ ہو۔ نثر ہو یا نظم جس مبحث پر بھی قلم اُٹھایا جائے الفاظ خیالات کا جامہ پہننے کے لئے صف بستہ کھڑے ہوں۔ اصنافِ ادب میں زبان کا مسئلہ قطعی طور پر ایک دوسری نوعیت کا ہے کیوں کہ اس کا ارتقاء بتدریج ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زبان ادب کی مزاجی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ حالات و واقعات ادب کے مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں، ہر ایک چیز جو وجودی شکل اختیار کرے۔ ہر ایک خیال جو دماغ میں آئے اس کے لئے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ضرورت زمانہ نے نئے الفاظ کو ایجاد کیا لیکن جب اس کی وجودی علّت ختم ہو گئی تو وہ الفاظ بھی متروک ہو گئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبان کے اس سقم کو دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لے کر پورا کر دیا جاتا ہے لیکن اس عمل سے اس کے حسن میں نکھار نہیں آتا۔ بلکہ وہ دوسری زبانوں کا چربہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ البتہ ماہرین لسانیات کی سعی و کوشش سے زبان اس سقم سے نجات پا جاتی ہے۔ ساری ادبی

کاوشیں جب ہی معراج کمال پر پہنچ سکتی ہیں جب کہ بیان کے ساتھ زبان پر بھی پوری پوری قدرت حاصل ہو۔ ہر ایک ادب پارہ کو افکار و خیالات کے ساتھ زبان و بیان اور اسلوب و انشا کے لحاظ سے بھی جانچا اور پرکھا جاتا ہے کیوں کہ شاعری ہو یا نثر یہ چیزیں ادب میں شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اچھی باتیں ہر ایک زمانہ میں کہی جاتی رہی ہیں۔ لیکن کہنے کے طرز میں اگر ندرت نہ ہو تو اس کی افادیت اور لذّت میں کمی آجاتی ہے۔ اسلوب بیان وہ آلہ ہے جس کی مدد سے ہم زبان کی ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں اور اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کے قابل استاد کلام کو ان کے مخصوص اسلوب سے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔

پروفیسر لیسل کومبئی (LASCELLAS. ABERCROMBIE) رقمطراز ہیں کہ :۔

"ہومر، ڈانٹے۔ شکسپیر۔ ملٹن بہترین ادب اس لئے دے سکے کہ اُنھیں زبان پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ ہم ان حالات سے واقف نہ ہوتے اگر ان کی لسانی قدرت ان الہامات کی مناسبت سے قوی نہ ہوتی۔"

ہماری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ یا ایک جملہ لاتعداد مراحل طے کرتا ہے۔ تب کہیں جاکر اہل زبان اس کو اپنا کر اظہار بیان کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جو بات لکھی جائے اس کے لئے یہ بھی لازم ہو کہ معنیٰ اور مقصد کے

ساتھ خوب صورت الفاظ کے جامہ سے بھی مزین ہو۔ ایک صاحبِ قلم کے لئے صاحبِ زبان ہونا بھی اوّلین شرط ہے۔ لفظی سرمایہ کی کمی زبان کی ترقی میں ہمیشہ حارج ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ کو قطرہ سے گہر بننے تک نہ صرف آرائشِ گیسو کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ نوک پلک پر بھی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔

Taj Tahir Foundation

باب سوم

دِلّی میں اُردو

گذشتہ ابواب میں ادب کا جو معیار پیش کیا گیا۔ اُس تک پہنچنے میں ساری دنیا کے لکھنے والوں (ادبا اور شعرا) نے کس قدر کامیابی حاصل کی اس کا جائزہ لیا جائے تو اُس کے واسطے لاتعداد بڑی بڑی ضخیم مجلّدات اور اُن کو تحریر کرنے کے لئے عمر نوح درکار ہوگی۔ لہٰذا فی الوقت آئندہ صفحات میں ہم برّصغیر پاک و ہند میں ادب اور وہ بھی صرف اردو ادب کا ارتقاء و تنزّل پر اجمالی روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے دِلّی کا حال سُنئے۔

اُردو زبان کی ابتدا کب سے ہوئی؟ وہ کیوں اور کیسے وجود میں آئی؟ اور مختلف منازل طے کرتی ہوئی کس طرح معراجِ کمال پر پہنچی؟ اس موضوع پر چونکہ کافی شرح و بسط کے ساتھ دوسرے علمائے تحقیق لکھ چکے ہیں اس لئے اس پر اگر مزید خامہ فرسائی نہ کی جائے تو چنداں حرج نہ ہوگا۔ نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کی جائے۔ یہ بات ہے تو

عجیب سی۔ اصولاً بھی اور رسماً بھی۔ لیکن بعض اوقات دِل وار فتہ کے مشورہ کی پاسداری کرنی ہی پڑتی ہے۔ معلوم نہیں اس استثنائی کیفیت پر باکمال اہلِ قلم کے دربار سے کیا فتویٰ صادر ہوگا۔؟

بہر نوع ہمارے موضوعِ گفتگو کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب اُردو عہدِ طفولیت سے نکل کر شاعروں کی زبان میں "کافر جوانی" کی حدود میں داخل ہو چکی ہے مثل مشہور ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ یہ ہی حال اس کا ہے۔ شوخی اور بے باکی کا کچھ نہ پوچھو کہ کیا عالم ہے ؎

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

ہر ایک شخص اس کی شیرینی اور حلاوت پر مٹا ہوا ہے کوئی دربند نہیں، بلا جھجک جہاں چاہتی ہے چلی جاتی اور اپنا مقام خود بنا لیتی ہے۔ کبھی محلوں میں جا کر شاہوں کے منھ چڑھتی ہے۔ کبھی حویلیوں میں جا کر بیگمات کی گود میں جا بیٹھتی ہے۔ اردو موسیقی کی تانیں ہیں کہ دل کو تڑپا دیتی ہیں۔ گلی اور کوچوں میں سے گزرتی ہے تو عوام اور کرخنداروں کی بولی بن جاتی ہے۔

برصغیر کی بھاری بھرکم زبانیں سنسکرت، عربی، فارسی اور بھاکا، اس طفلِ نوخیز کو از سر تا پا قیامت بنتے دیکھ رہی ہیں اور خاموش ہیں، بالشتوں سے ناپنے کے دن ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو ادب کا ابتدائی سرمایہ شاعری پر مشتمل ہے۔

ارسطو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جب اپنی کتاب "سیاسیات" لکھ رہا

تھا اس وقت اس کا شاگرد سکندر ساری دنیا کو فتح کرنے کے عزم سے یونان سے نکلا۔ فتوحات کا ایک سیلاب تھا جو بکثرت چھوٹے بڑے ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

لیکن انسانیت کے اس علمبردار ارسطو نے دنیا کے ایک عظیم فاتح کے کارہائے نمایاں کو پرِ کاہ کے برابر وقعت نہیں دی۔ اور اپنی کتاب میں صرف چار چھ سطروں سے زیادہ اس کے ذکر کے لئے نہ نکال سکا۔ یہی حال اس وقت دلّی کے اہل قلم اور وہاں کی علمی سرگرمیوں کا تھا۔ سلطنت آمادہ بہ زوال ہو چکی تھی۔ انقلاب کا خونی ہاتھ لال قلعہ کی فصیل تک پہنچ چکا تھا۔ دور بیں اور قیافہ شناس جان چکے تھے کہ امروز فردا میں کیا ہونے والا ہے۔ دعا کی قبولیت کا وقت گذر چکا تھا۔ درِ توبہ پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے دیدۂ عبرت کے لئے تاریخ ایک اور ادبار زدہ اور برگشتہ قسمت قوم کے احوال کو اپنے صفحات پر ثبت کر رہی تھی۔ لیکن آفریں ہے صاحبِ بصیرت طبقہ پر جو اپنی فرصتِ چند روزہ کو غنیمت سمجھ کر علم و ادب کی خدمت میں اس درجہ منہمک تھا کہ گویا کہ اُن کے گرد و پیش کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے خانوادہ کے لوگوں نے علم و عمل کی جو شمعیں فروزاں کیں اُن سے دلّی کے بام و در چمک رہے تھے چشمۂ فیض جاری تھا۔ مساجد اور مدرسے۔ تجدد و اصلاح کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ پند و نصائح اور احکام شرعیہ کی تلقین و ہدایت سے اصلاح ظاہری و باطنی کا کام لیا جا رہا تھا۔ سید احمد شہید کی تحریک کا بھی سب سے بڑا مرکز اس وقت دلّی تھا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں کہ[1]۔

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

"مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے یہاں علمی دربار جمتا تھا۔
اگر کوئی شخص دہلی جاتا اور چاہتا کہ سارے اہلِ کمال کو بیک وقت
دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رُخ
کرتا۔ غالب۔ مومن۔ شیفتہ۔ میر مجروح۔ ذوق نیز متعدد
علماء و فضلا کا بھی زبردست اجتماع ہوتا تھا۔"

ان کی تقلید کرنا دلی کے اہل کمال اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ اب فارسی و عربی کا رواج اُٹھ رہا تھا۔ اس کی جگہ اُردو لے رہی تھی، میر و سودا اور مظہر و درد کے خیاباں میں بہار آرہی تھی۔ نظم کے ساتھ نثری ادب کی بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندان عالی قدر حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین، قرآن حکیم کا اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی حدیث کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ شریف" کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔

اب اُردو کو مسند علم و فضل کو سنبھالنا تھا۔ اُس نے اپنا مقام از خود پیدا کر لیا۔ لچک اس بلا کی تھی کہ جس سمت چاہے جھکا لو۔ متانت و سنجیدگی میں فارسی کو بھی پیچھے بٹھا دیا۔ میر امّن کی "باغ و بہار" ابتدائی کتابوں میں سے ہے۔ اسی زمانہ میں مرزا علی لطف نے اپنا تذکرۃ الشعراء اردو زبان میں لکھا۔

مولانا اسماعیل شہید نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تقویۃ الایمان" لکھی اور اردو کی مملکت وسیع سے وسیع تر ہو رہی تھی، قرائن و آثار اس کی اقبال مندی کی نشان دہی کر رہے تھے، میر امّن دہلوی۔ حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس کی نثر دورِ متوسط کی زبان کہلائی ہے۔ اس کی سلاست و روانی دیکھ کر غالب اور ان کے عہد کے سارے اہلِ قلم نے

بجائے فارسی کے اُردو کو اپنے اظہارِ خیال کے لئے منتخب کیا۔ غالب نے ۱۸۵۰ء کے بعد سے اپنے مکاتیب اُردو میں لکھنا شروع کئے۔ ۱۸۶۸ء میں ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں ان کا دوسرا مجموعہ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے چھپا جس کا دوسرا حصہ ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا۔ مولانا حالیؔ یادگارِ غالب، کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مرزا غالب کی جس قدر شہرت ہندوستان میں اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم سے نہیں ہوتی۔"

اختر جوناگڈھی رقمطراز ہیں کہ:۔

"درحقیقت غالب نے اس اردو نثر کی بنیاد رکھی جس نے اس کا رُخ بدل دیا۔ غالب کی تحریریں محض رقعات و مکاتیب تک محدود نہیں، اس دائرہ میں فکر و خیال کا کون سا پہلو ہے جو نمایاں نہیں"۔

مولانا شبلی رقم طراز ہیں کہ:۔

"اُردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسیّد تھے اس کا سنگ بنیاد دراصل غالب نے رکھا تھا۔ سرسیّد مرزا کے طرز سے مستفید ہوئے"

۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر نے دہلی سے اُردو کا ایک اخبار "اُردو اخبار" کے نام سے جاری کیا۔ اس کے بعد دو اور اخبار "مشرق" اور "فوائد الناظرین" دلی

سے شائع ہوئے۔ اسی زمانہ میں سرسید کی "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ ماسٹر رام چندر نے اُردو کا ایک ماہنامہ "خیر خواہِ ہند" کے نام سے جاری کیا۔ لال قلعہ میں اس کی باریابی بلکہ غیر معمولی پذیرائی نے چار چاند لگا دئے اور اب اُردو میں نثر اور شعر لکھنا وجہ امتیاز بن گیا۔ حال و قال کی مجلسیں ہوں یا شعر و ادب کی صحبتیں۔ سب میں اُردو اظہار خیال کا ذریعہ تھی۔

نئے اسلوب وضع کئے گئے قواعد و ضوابط کی تدوین ہوئی۔ شاعری ہو یا نثر ایک ایک لفظ کو کسوٹی پر کسا جا رہا تھا۔ غلط تشبیہہ اور استعارے اور بے معنیٰ الفاظ کی بہتات سے زبان کو صاف کیا جا رہا تھا۔

ادبا اور شعرائے دلّی نے ایک خاص کام یہ کیا کہ زبان کی ترویج و اشاعت کے ساتھ اس امر پہ زور دیا کہ اردو ادب کو سنجیدہ اور متین خیالات کا حامل ہونا چاہیئے۔ جو چیزیں لکھنوی ادب میں جان سخن کا درجہ رکھتی تھیں انھیں متروک قرار دے کر اپنی نثر و نظم سے ثابت کیا کہ اُردو زبان کو صرف فرصت میں دل بہلانے اور حُسن و عشق کے ذکر و اذکار تک محدود نہیں ہونا چاہیئے بلکہ۔ ؏

"کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے"

دیکھتے ہی دیکھتے اس زبان کا اردوئے معلّیٰ کے خطاب سے ملقب ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" اردو کی مانگ کا سیندور ہے۔ اس کا سہاگ ہے۔ اُنھوں نے ایک نیا اسلوب دے دیا اور اردو ادب میں ایک نئی صنف کا اضافہ کیا۔ اگر یہ کتاب دنیا کے اُس عہد میں لکھی جاتی جب کہ ذہن انسانی غیر پُختہ حالت میں تھا۔ تو اُردو

زبان کی الہامی کتابوں میں اس کا شمار ہوتا۔ یہ ایک ایسی تصنیف یا تخلیق ہے جس نے اپنے عہد کے متنوع نظریات سے ٹکر لے کر اپنا مقام پیدا کیا۔ "آبِ حیات" کا شمار انقلابی ادب پاروں میں ہے۔

آزاد کے متعلق ناظر کاکوروی لکھتے ہیں:۔

"وہ خوش فکر۔ خوش گو اور لطیفہ سنج تھے۔ حکایتی نثر کا جو دل نشین انداز انھوں نے اختیار کیا وہ اب بھی بے نظیر ہے۔ تمثیل نگاری کے موجد تھے، ان کی نگارشات ادبی نے عوامی تشنگی کو دور کرنے کے لئے آبِ حیات بخشا۔"

اس کے علاوہ اس زمانہ میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے رسائل اور کتابچے اردو میں شائع ہوئے۔ جن میں جہاد اور اصلاحِ معاشرت پر زور دیا جاتا تھا۔ تلوار چھن چکی تھی۔ نوکِ قلم سے حکومت و اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا جا رہا تھا۔ تخت جائے تو جائے انسان اور اس کی عظمت تو برقرار ہے۔ ع

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی[1]

---

[1] "جائزے" ص۱۲

باب چہارم

لکھنؤ میں اُردو

مولانا عبدالحلیم شرر کسی قدر شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ رقمطراز ہیں کہ :-

"لکھنؤ میں ان دنوں شاعری کا چرچا تھا۔ وہاں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعراء جمع کئے جاتے تو ان کی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے آگے نہ بڑھتی"[1]

اردو میں مثنوی کا رواج قدیم سے ہے اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا مثنوی لکھنے کا رواج بڑھتا ہی چلا گیا اور شاعری کی یہ صنف اس کی ترقی کی معراج قرار دی گئی ہے۔ گلزار نسیم، طلسم اُلفت، مثنوی بے نظیر۔ بدر منیر، مثنوی لیلیٰ مجنوں، بہار عشق۔

---

[1] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ج ۳ ص ۱۳۱

فریب عشق اور زہرِ عشق وغیرہ وغیرہ، مشہور ہیں اس صنف کے سرخیل نواب مرزا شوق قرار پائے۔ شہرتِ عام اور بقاء دوام کا قرعۂ فال ان کے نام نکلا مولانا شرر لکھتے ہیں کہ:-

"نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے "حسن" پرستوں میں تازہ، روح پھونک دی تھی۔ مرزا نے حسین عورتوں پر عاشق ہو کر شاعری کو اس کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ قیامت یہ تھی کہ ان مثنویوں کی زبان ایسی خوبصورت بے تکلف اور شستہ تھی کہ مہذب اور متین لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لئے بغیر نہ رہا جاتا[1]"

مثنوی زہرِ عشق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام
غمِ فرقت سے دل ہے بے آرام
شکل دکھلا دے کبریا کے لئے
بام پر آ ذرا خدا کے لئے

التجا نامہ کا جواب جو آیا ہے وہ بھی سنئے۔

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانیں
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

قلم کار ہوا ہے کہ ہر ایک نشیب و فراز سے گذرتا چلا جاتا ہے کہیں ٹھوکر نہیں کھاتا۔

---

[1] "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"۔

مرزا شوق کے متعلق مولانا حالی اپنی کتاب "مقدمۂ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں کہ:-

"میر حسن کے بعد مرزا شوق نے غالباً واجد علی شاہ
کے اخیر زمانہ میں مثنویاں لکھنی شروع کیں۔ لیکن یہ بات
تعجب سے خالی نہیں کہ مرزا شوق کو اپنے اسکول کے
خلاف مثنوی میں ایسی صاف بامحاورہ زبان لکھنے کا
خیال کیوں کر پیدا ہوا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے شوق کے اس شاہکار پر سند کا درجہ رکھتی ہے، لکھتے ہیں کہ:-

"اردو کے ایک بدنام شاعر نواب مرزا شوق کے قلم نے
جو شگوفے کھلائے ہیں جس اچھوتے انداز سے شرفا طبقہ کے
پردہ نشین گھروں کا نقشہ کھینچا ہے وہ انھیں کا حصہ
تھا۔"[1]

مرزا شوق کے لئے نمونہ موجود تھا کیونکہ عاشق مزاجوں اور رنگین نوائوں کے میر کارواں آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنی مثنویوں میں خود اپنے عشق کی داستانیں جس بے باکی سے نظم کی ہیں اس پر تہذیب آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ ثقافت کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے۔ ہوش و خرد کے دربار سے انھیں کون سا فتویٰ دیا جائے گا؟ اگر اس کا پاس لحاظ کرتے تو تاریخ میں اخلاقی مجرموں کی صف میں کیسے جگہ پاتے۔

---

[1] "اردو کا ایک بدنام شاعر" مقالہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی "سہیل" بابتہ اپریل، مئی، جون ۱۹۲۷ء۔

اور عیش کوشیوں میں ان کا مثالی کردار پیش کرنے کی کسے توفیق ہوتی۔ رُسوا ہوئے اور وہ بھی سرِ بازار۔ قسمت کا ستارہ گردش میں تھا۔ لیکن شعر و ادب پر بہار آئی ہوئی تھی۔ ع

قیس ہر رنگ میں بھی بے سروساماں نکلا

خدا جانے سرزمین لکھنؤ کی کیا خصوصیت تھی کہ تصنع اور تعلّی شعر و ادب کی معراج قرار پائی تھی۔ معاملات حسن و عشق پر اسی کو قلم اُٹھانے کی اجازت تھی جو از خود ان منزلوں سے گذر چکا ہو۔ بڑے بڑے ثقہ بزرگ مولانا ایسی زمین میں مضمون باندھتے کہ لوگ پڑھتے اور عرقِ انفعال سے پانی پانی ہو جاتے۔ کیف و سرمستی کے اس ماحول میں ڈوب کر اُنھوں نے جو ادب پارے تخلیق کئے وہ دنیائے عشق میں الہام کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا شرر رقمطراز ہیں کہ:۔

"لب اگر کوئی علمی شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی کیوں کہ بادشاہ خود شعر کہتے اور شعراء کی قدر کرتے تھے۔"

پیا جان عالم نے رختِ سفر کیا باندھا۔ شاعری کی دنیا پر بھی سکرات کا عالم طاری ہو گیا شاعری کا سہاگ لٹ گیا۔ شعر کیوں کہیں؟ کس کے لئے کہیں؟ اقلیم سخن کا بادشاہ مات کھا کر مٹیا برج (کلکتہ) میں گردش لیل و نہار کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اب قلم کا رُخ نثر کی جانب ہے۔ سب سے پہلے رجب علی بیگ سرور نے

فسانۂ عجائب لکھ کر اس کی ابتدا کی، اس زمانہ میں ایک دوسری کتاب محمد بخش مجروح نے لکھی جس کا نام نورتن تھا۔ اس سلسلہ میں اودھ پنچ کی خدمات بھی ناقابلِ انکار ہیں۔ شرر لکھتے ہیں کہ:۔

"جہاں تک نثر اُردو کا تعلق ہے اُس کی بنیاد لکھنؤ میں پڑی، ہاں جدید رنگ کا آغاز دلّی سے ہوا۔"

داستان گوئی جس کو ادب میں کوئی درجہ حاصل نہیں تھا۔ لکھنؤ کے درباری ماحول اور تعلّی پسند طبائع نے اس میں وہ نکات اور باریکیاں پیدا کیں کہ من گھڑت قصّوں اور کہانیوں کے انبار در انبار لگا دئے۔ لوگ سنتے اور سر دُھنتے۔ عظمتوں کے سارے چراغ ایک ایک کر کے گل ہو گئے تھے۔ ع

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

جو چند شمعیں باقی رہ گئی تھیں وہ بھی بجھا ہی چاہتی تھیں لیکن داستان گو جب اپنی پُر اثر سحر آفریں زبان میں شاہی جاہ و حشم ان کے رعب و دبدبہ کی تصویر کھینچتے تو سلطنت جانے کے غم کا ایک حد تک مداوا ہو جاتا تھا۔ افیون کھاتے اور داستانیں سُنتے۔ تھوڑے تھوڑے وثیقوں پر دیوان خانوں میں آبرو بنائے بیٹھے تھے۔ کشتیٔ حیات کو سرابوں میں کھینچنے کی عادت سی ڈال لی تھی۔ انسانی فطرت کا بھی عجب حال ہے قسمت کے اٹل فیصلوں سے کبھی اس نے آسانی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ابھی ایک تیر کھایا ہی تھا کہ دوسرے لمحہ دنیا نے دیکھا کہ مرہم کی جستجو ہو رہی ہے۔ ابھی زخم صرف ایک ہی لگا ہے لیکن اس کی چارہ گری کے ہزار جتن کئے جا رہے ہیں۔ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے کہ کس قدر تیر دل و جگر چھلنی کرنے کے لئے ترکش میں پڑے تڑپ رہے ہیں جن کے وار

اُنھیں بہنا ہیں ۔ ع

سوائے خونِ دِجگر سو جگہ میں خاک نہیں

غمِ روزگار ہو یا غمِ جاناں ۔ غمِ زندگی کی بھول بھلیوں سے نکلنا کسی حال میں گوارا نہیں ۔ حقائق سے فرار میں عافیت باقی رہ گئی تھی ۔ ذرا اس قنوطی دَور کا تصوّر کیجئے ۔ جہانبانی اور جہاں داری کا آفتاب لبِ بام آچکا ہے ۔ ساری قدریں ایک ایک کرکے دم توڑ رہی ہیں ۔ رنجوری و مہجوری کے اضطرابی لمحات میں "زہرِ عشق" "فسانۂ آزاد" "طلسمِ ہوشربا" نہ لکھتے تو کیا لکھتے ۔

"فسانۂ آزاد" طولِ بیان اور شوخیٔ زبان کے لحاظ سے دبستانِ لکھنؤ کی سب سے عظیم پیش کش ہے ۔ اس طولانی قصّہ میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو افسانہ میں جانِ سخن کا درجہ رکھتی ہیں ۔ اس کی ایک افادیت یہ ہے کہ ارادی یا غیر ارادی طور پر رتن ناتھ سرشار کا قلم اسی ماحول کی عکاسی کرتا ہے جو اس کے گردوپیش موجود ہے ۔ اُس نے اپنی تصویروں کو دلکش اور رنگین بنانے کے لئے مانگے تانگے کے رنگوں کو استعمال نہیں کیا ۔ اپنے افسانے کو کامیاب بنانے کے لئے جس راستہ کا انتخاب کیا اُس پر وہ تنہا سرگرم سفر رہا ۔ کردار ڈھونڈنے کے لئے اسے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ وہ اپنے دائیں بائیں سے چن لیتا ہے اس کے کردار ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سے جانتے پہچانتے ہیں، اور نفسیاتی طور پر ایک دوسرے سے واقف ہیں کیونکہ تکلّف درمیان میں حائل ہو تو رنگِ محفل پھیکا پڑ جاتا ہے ۔ افسانہ کے خالق کو اپنے "آزاد" اور "خوجی" میں کوئی عیب ایسا نظر نہیں آتا جن کو برسرِ عام اور روزِ روشن میں

پیش کرتے ہوئے گھبراہٹ ہوتی ہو۔ دونوں کردار معاشرہ کے ٹکسالی شریف انسان ہیں۔ ان کے آپس کے سوقیانہ اور عامیانہ مکالمے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوتے ہیں اور جن کو سن کر متانت و سنجیدگی منہ پھیر لیتی ہے تو کیا پروا۔ سرشار نے انھیں صرف زندہ دلانِ لکھنؤ کے لئے لکھا ہے۔ باہر والوں کے لئے نہیں۔ اس سے زیادہ طویل داستان طلسمِ ہوشربا ہے مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ پوری داستان بڑی تقطیع کے تقریباً چالیس ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی داستان ہے کسی زبان میں اس سے زیادہ طویل افسانہ کوئی موجود نہیں۔ خیالات و تصورات کہیں سے کہیں بھی لے گئے ہوں لیکن داستان انیسویں صدی کے شہر لکھنؤ کا مرقع ہے"[1]

اس کے بعد لکھنؤ اسکول کے سلسلہ میں اگر مرزا رسوا کی اچھوتی اور مرصّع کتاب اُمراؤ جان ادا کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ باب غیر مکمل رہ جاتا ہے ؎

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا میرے آگے

مرزا نے اپنے قلم حقیقت رقم سے طوائف کی زندگی کے دونوں رُخ دکھا کر جس جرأت کے ساتھ نام نہاد "شریف طبقہ" کا بھرم کھول کر دکھایا وہ انھیں کا حصّہ تھا۔ امراؤ جان معاشرہ کی ایک قابلِ نفرین ہستی ہونے کے باوجود

---

[1] مقالہ "انیسویں صدی کا تمدن طلسم ہوشربا کے آئینہ میں" العلم جولائی ۱۹۵۱ء۔

ہمدردی کی مستحق ہے۔ وہ جب اپنے ابتدائی حالات۔ اپنا محلہ۔ گھر۔ بہن بھائی۔ ماں باپ کا ذکر کرتی ہے تو پیرایۂ بیان خاصہ دل گداز اور پُر اثر ہو جاتا ہے۔ اور پوری مجلس پر اداسی چھا جاتی ہے۔ اس وقت اس میں کئی کردار یکجا ہو جاتے ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں۔ وہ ایک شریف گھرانے کی کمسن لڑکی ہے۔ بہن اور بیٹی ہے۔ خاندان اور محلہ کی آبرو ہے۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت کے لئے خود کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتی۔ وہ تو خود محض وقت کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے۔ ذہنی طور پر ہنوز اس نے ان حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا جو کوٹھوں کی روایات سے وابستہ ہیں۔ جب کسی بوالہوس کا ذکر آتا ہے تو اس کی نسائیت کو ٹھیس لگتی ہے، اُس کا پندار جاگ اُٹھتا ہے۔ وہ جس انداز سے اپنی مظلومی اور بے چارگی کی داستان بیان کرتی ہے اس کا اثر سپہروں قاری کے دل سے محو نہیں ہوتا اور وہ سوچتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔

نیز یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عورت ہر بات کو انگیز کر لیتی ہے لیکن اپنی نسائیت کو مجروح کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ وہ کوٹھوں کی رونق بنائی جائے۔ یا حرم سراؤں کی۔ اس کا عورت پن ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ روایتی پابندیوں کے برعکس اس نے صرف ایک بار کسی سے محبت کی ہے اور دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ اخلاقی بلندی کی یہ معراج نہیں تو اور کیا ہے کہ جو کچھ اپنے اوپر بیتی تھی اس کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ مفتیِ شہر کا ڈر، نہ اخلاق کے اجارہ داروں کا۔ بلند و پست کے امتزاج سے نقشہ پر ایک تصویر اُبھرتی ہے جس کا نام "امراؤ جان ادا" ہے۔ ایک مرتبہ سید علی بلگرامی مرحوم نے لندن میں

اپنے لکچر میں کہا تھا کہ "مسلمانوں کے تمام آثار اور کارنامے مٹ جائیں صرف دو کتابیں باقی رہ جائیں تو کافی ہیں"۔

یہ ہی چیز رسوا کے اس ادب پارہ پر صادق آتی ہے۔ خلوتوں کی باتیں جلوتوں میں کہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں اس جرأت رندانہ کے لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ع

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے

دبستان لکھنؤ نے ادب کے نام پر جو بے ادبیاں کی ہیں۔ وہ مرزا رسوا کے اس ادبی تخلیق کے صدقہ اور طفیل یقیناً اس قابل ہیں کہ انھیں معاف کر دیا جائے۔

لکھنؤ اسکول سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں پر سب سے بڑا یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو جو کچھ دیا اس میں فکری اور تحقیقی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی لیکن ایک زوال پذیر معاشرہ کی مزاجی کیفیت میں وہ ٹھہراؤ کب ہوتا ہے جو مذکورۂ بالا قسم کا لٹریچر تخلیق کر کے ادب میں اضافہ کرے۔ اس کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے جس کے واسطے اس دور میں کوئی گنجائش باقی نہ تھی ؎

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے روئے سخن وا کرے کوئی

دبستانِ لکھنؤ کے شرر آخری چراغ ہیں ان کے دور میں ادبی نظریات بدل چکے تھے۔ مسائلِ زندگی سرعت سے شاعری اور ادب میں داخل ہو رہے تھے۔ عام رجحان یہ تھا کہ ادب معاشرہ کی عکاسی ہی کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی رہبری

اور رہ نمائی کے فرائض بھی انجام دے۔ ادب کو صرف لذتِ کام و ذہن کے لئے استعمال کرنے کا جذبہ سرد ہوتا جاتا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں لکھنؤ اسکول نے جو ادب تخلیق تالیف یا تصنیف کیا وہ اس ذہنی ناآسودگی کا نتیجہ تھا جو اس وقت پورے معاشرہ پر طاری تھا۔

ادب کی مزاجی کیفیت سمندر کے پانی جیسی ہے وہ جلد یا بدیر ہر اس چیز کو اگل دیتا ہے جو اس کے رنگ کو گدلا کر دیتی ہے۔ خالی ذہن جن کے سامنے زندگی کا کوئی مثبت نصب العین نہ ہو۔ غیر مقصدی ادب ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے لٹریچر کی خاصیت ان پھولوں جیسی ہوتی ہے جو دن ڈھلتے ہی اپنی خوشبو اور رنگ کھو دیتے ہیں۔ اور نہ تو کسی کے مشامِ جاں کی تازگی کا سبب بنتے ہیں اور نہ کسی کے زیبِ گلو بننے کے لئے پروئے جا سکتے ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر مطلع ادب پر اس وقت نمودار ہوئے جب کہ ادبی قدریں سرعت سے تغیر پذیر ہو رہی تھیں۔ انتشاری کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ وقت کا تقاضہ تھا کہ ادب ماورائیت اور افسانویت کے دھندلکوں سے نکل کر حقائق کی روشنی میں آگے بڑھے۔ اب تک اس نے جن حیوانی اور سفلی جذبات کو اُبھارنے کا جو کام کیا تھا اُس کی مزید مانگ نہ رہی تھی۔ وہ لکھنؤ اسکول کے پہلے اصلاح پسند ادیب ہیں اور جس طرح سے گورکی کے قلم نے روسی ادب کی تاریخ میں اجتہادی دور کا آغاز کیا۔ اسی طرح شرر نے ایک ایسے طرزِ نگارش کی اساس ڈالی جو حقیقت پسندی پر مشتمل تھا گورکی اور شرر کی تحریروں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کی

قلمی کاوشوں کا دائرہ تقریباً نصف صدی تک محیط ہے۔ اُنھوں نے ادب کو جو کچھ دیا وہ مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے۔ صفحۂ دہر پہ کیسے کیسے نقوش اُبھرے اور مٹے۔ زمانہ کے سرد و گرم نے تاریخ پر کیا کیا اثرات مرتب کئے۔

کسی کے نالہ وشیون سے پیرِ فلک کا زہرہ آب۔ آب ہوا جاتا تھا۔ کوئی قوسِ قزح جیسے رنگ بدل بدل کر ہر کہہ ومہہ کا مرکزِ توجہ بنا ہوا تھا۔ اسلامی عظمتِ رفتہ کے کھنڈروں پر اغیار جشن چراغاں منا رہے تھے۔ ہم نے دلوں کے چراغ جلا کر اس کی روشنی میں کشتی حیات کو کھینے کے لئے آگے قدم بڑھائے۔ ؎

بیٹھے تھے ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مولانا شرر کی قلمی سرگرمیاں کسی مخصوص مکتبۂ فکر کی زیرِ بار منت نہیں علی گڑھ تحریک، شبلی اسکول۔ دیوبندی نقطۂ نظر سے وابستگی۔ احوال دل کہنے کے لئے کسی مرکز اور کسی مقام کی اُنھیں ضرورت نہیں تھی، بلکہ جس جگہ دم لینے کے لئے ٹھہر گئے وہیں اپنی بپتا سنانے لگے ؎

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

اودھ کی بربادی پر کیسے درد سے لکھتے ہیں کہ:-

"زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا جو میرا ساتھ نہ دے گا مٹ جائے گا۔ یہ آواز کسی نے نہ سنی پورا ہندوستان

مٹ گیا انھیں میں اودھ کی سلطنت بھی تھی۔ محلہ کے محلہ
اُجڑتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند روز نہ
کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان نہیں رہے گا۔"

نہ کسی سے گلہ نہ شکوہ۔ اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی جو سزا مل رہی تھی اس کے لئے خود اپنے ہی کو ہدف ملامت بنا رہے ہیں گو بادلِ ناخواستہ ہی سہی۔ جب وہ اپنے ناولوں میں مسلمانوں کی فتوحات اور ان کے عروج کی منظر کشی کرتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ زوال کی ہر ایک حکایت کو اس طرح سے کالعدم کر دیں کہ اس کی بھولے سے بھی یاد نہ آئے۔ لیکن نہیں ایسا کیوں ہونے لگا۔ حقیقت کے تلخ گھونٹوں کو زبردستی نگلنا ہی پڑتا ہے۔ خواہ جی چاہے یا نہ چاہے۔

"شرر پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے اسلامی تاریخ
سے متاثر ہو کر اردو میں ناول نگاری کی ابتدا کی۔ وہ اس
زبان کے "رچرڈسن" ہیں۔ کردار نگاری کے لحاظ سے "والٹر
اسکاٹ" ہیں جس نے اپنے ناولوں میں اعلیٰ طبقہ کی سیر تیں
پیش کی تھیں۔"[1]

اُنھوں نے اپنی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں تصویر کے دونوں رُخوں کی کامیاب عکاسی کر کے اربابِ بصیرت کے لئے کافی تاریخی مواد فراہم کیا ہے۔ اور غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ ایک جانب دربارِ اودھ کی توبہ شکن رنگینیاں تھیں۔ دوسری

---

[1] رسالہ سہیل علی گڑھ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

جانب علما و فرنگی محل، مجتہدان فیض آباد اور حکمائے خیر آباد کی علمی موشگافیاں اور معقولی مباحث کی مصروفیات تھیں۔ وقت کا گھڑیال خبردار کر رہا تھا کہ طوفان نوح آنے والا ہے لیکن علمائے کرام راضی برضا خانقاہیں اور مدرسے آباد کئے۔ معقولات کی قدیم اور صدیوں پرانی کتابوں پر شروح و حواشی کے انبار لگا رہے تھے اور آنے والے انقلاب سے بے خبر تھے، شرر بھی اس ماحول کی پیداوار تھے مگر انھوں نے زمانہ کے رجحانات کو پہچان لیا تھا۔

مولوی عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں کہ:۔

"وہ کافی عرصہ تک فرنگی محل میں زیر تعلیم رہے"

مذہبی اور قومی رنگ جو ابتدائی عمر میں لکھنؤ میں چڑھ چکا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ پختہ ہوتا چلا گیا۔ قیام دہلی کے دوران مشہور مصلح عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا ترجمہ کیا یہ ان کی پہلی تصنیف تھی۔ "اودھ" "محشر" "اتحاد" اور "دل گداز" ان کی ادارت میں نکلتے رہے۔ شرر نے ناولوں کو تاریخ و مذہب کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

سید الطاف علی بریلوی صاحب رقمطراز ہیں کہ۔

"شرر نے افسانہ کے ذریعہ مسلمانوں میں تاریخ اسلام پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور یہ تدبیر بدرجہ اتم کامیاب ہوئی"[1]

---

[1] "تنقیدی ادب" - مرتبہ مسیح گل۔

ان کے ہر ایک ناول میں اصلاحی پہلو اس حد تک اُجاگر ہوتا ہے کہ اکثر مقامات پر عبارت "میتھوارنلڈ" جیسا واعظانہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر لیتی ہے میٹیا برج سے لے کر حیدر آباد اور رامپور میں جن "رموز مملکت" کا ان پر انکشاف ہوا۔ اپنے مشہور ناول "حسن کے ڈاکو" اور "دربار حرام پور" میں اُن کی پوری پوری تصویر کشی کی ہے۔ اُنھوں نے اس عہد میں والیانِ ریاست کی مجرمانہ شخصیتوں کو دیبا اور حریر کے پردوں میں سے نکال کر دنیا کو ان کی اصلی مسخ شدہ صورت میں دکھلایا کہ لو دیکھو کہ ان کے اندر کا اصل انسان کس قدر خوفناک اور بھیانک ہے۔ وقت کے یہ ابوالہول جن کی دہشت کا سکہ صدیوں سے لوگوں کے قلوب پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے قلم نے ان کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ "ملا سعد اللہ" کا کردار سارے علمائے سوکا کردار ہے۔ آزادیِ وطن کی تاریخ میں ریاستوں کی آزادی کی جدوجہد کے باب میں ان کا نام سرِ فہرست ہوگا۔

Taj Tahir Foundation

باب پنجم

اُردو ادب پر انقلاب ۱۸۵۷ء کا اثر

اپنے قومی اور انقلابی ادب کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں اس عہد کے سیاسی پسِ منظر کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ برصغیر کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکا ہے۔ لال قلعہ کی فصیلوں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ تخت و تاج کا اقتدار چند روز کا اور مہمان ہے۔ غیر ملکی سوداگروں کے حوصلے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ قلعہ شاہی کی برائے نام حیثیت انھیں خار کی طرح کھٹکتی ہے۔ فلکِ ستم شعار اُس کے مٹنے کا تماشہ دیکھنے کا منتظر ہے۔ لیکن یہ طرفہ تماشہ بھی ہے کہ وارثِ تخت و تاج عیش کوشیوں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ پورا ملک اس (قنوطی؟) انحطاطی دور سے گذر رہا ہے جس کی حدیں موت کی سرحد سے جا کر مل جاتی ہیں۔ ہر ایک شخص اپنی جگہ بے چین اور مضطرب ہے لیکن قلعہ کی دنیا میں "داستان ایں و آں" کا ذکر کرنا سوئے ادب پر محمول کیا جاتا ہے۔

Taj Tahir Foundation

ع ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ

انسان جبلّی طور پر سکون پسند واقع ہوا ہے۔ ساری نیک خواہشات اور بلند ارادے پورے نہیں ہو پاتے۔ محض اس لئے کہ اس نے جس اچھی یا بری ڈگر پر ایک بار چلنا اختیار کیا تو اس سے گریز کرنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اس کی اسی فطری کمزوری نے دنیا میں غلامی کی رسم کی داغ بیل ڈالی اور انسانوں کے بڑے بڑے گروہ ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں انسانی تاریخ مسلسل باہمی آویزشوں کا مرقع ہے مشہور مفکر "کامت دونوائے" رقمطراز ہے کہ :۔

"جب سے حیات کی داغ بیل پڑی معلوم ہوتا ہے کہ
ارتقا کا معیار آزادی ہے"[1]

لیکن دنیا کی بہت کم اقوام اس نعمتِ عظمیٰ سے متمتع ہو رہی ہیں۔ انسان کے تین بنیادی حقوق ہیں۔ حفاظتِ جان، آزادی اور مسرت، جن کے حصول کے لئے جہدِ مسلسل ناگزیر ہے۔ جبلّی راحت پسندی نے لاتعداد خلفشار پھیلائے ہیں انسانی عظمت آزمائش میں ہے۔ سال پر سال بیتتے چلے جاتے ہیں لیکن جمودی کیفیت جو طاری ہوئی ہے وہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ وقت ہزار بار انھیں منزلِ جاہ و حشم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے لیکن یہ اُس پر لبیک نہیں کہتے۔ سرزمین وطن پر غاصبوں کا قبضہ ہو گیا ہے سیاسی اور مدنی حقوق سلب کر لئے گئے ہیں تو کیا پروا، تھوڑی سی مذہبی اور معاشری آزادی ہی پر اکتفا کر لیں گے۔ اگر زندگی کے راستوں پر

---

[1] مقدر انسانی ص ۱۹۱ شایع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

چلنے کی ممانعت ہے تو گوشوں میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ تاکہ وہاں سے نکلنے کا سوال ہی درمیان میں نہ آئے۔ زمانہ کروٹوں پہ کروٹیں بدل رہا ہے لیکن یہ ہیں کہ اپنی واماندگیوں میں کچھ اس طرح کھوئے ہوئے ہیں کہ: ؎

قیامت ہی میں ہوش آئے تو آئے　　کیسا آرام دیا ہے پر و بالی نے مجھے

لیکن مہربان قدرت نے ہر کلیہ کا ایک استثنائی پہلو بھی رکھا ہے اور انسانوں کے درمیان ایک طبقہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو اپنی بصیرت و بصارت کے زور سے نہ صرف اپنی ذات سے اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ پوری نسل انسانی کو اس سے نجات دلانے کے درپے رہتا ہے۔ فطرت اس کو وہبی اور اکتسابی دونوں طرح بھرپور طریقہ سے نوازتی ہے، یہ اپنے دور کا عنوان ہیں اور انھیں وقت نے آواز دے کر بلایا ہے۔

عین اُس وقت جب کہ زندگی بہر رنگ موردِ الزام بنتی چلی جا رہی تھی پورے ملک میں مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے لائق فرزندوں کی اصلاح و تجدید کی تحریکات ایک انقلاب نو کے لئے زمین ہموار کر رہی تھیں۔ اُن کے مدرسوں اور خانقاہوں سے جو لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے وہ جہاں اور جس جگہ جاتے اپنے علم و عمل کے ذریعہ ایک انقلابی اسپرٹ لوگوں میں پیدا کر دیتے۔ تلوار کی جگہ قلم نے لے لی تھی۔

جنگ بکسر میں شکست کے بعد تلوار کو زنگ لگ گیا۔ بازو شل تھے ہاتھوں میں سکت باقی نہیں رہی تھی۔ ایسی صورت میں نوکِ قلم سے کام نہ لیتے تو اور کیا کرتے۔ اصناف شعر و ادب کی کئی قسمیں ہیں۔ ادب کی ایک قسم وہ

ہے جو قاری کو کبھی دعوتِ فکر و عمل نہیں دیتا۔ زندگی کا بوجھ اُٹھانے کے لئے ایک گونہ بے خودی کی کیفیت طاری رکھتا ہے۔ دل کے بہلانے کے جہاں اور ہزار جتن کئے جاتے ہیں اُنھیں میں سے یہ ادب بھی ہے۔

وہ ہمیں کوئی پیغام نہیں دیتا۔ کوئی نیا راستہ نہیں دکھاتا۔ اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصد۔ اس کی صفت اُس میٹھی لوری کی سی ہے جو سونے سے پہلے ماں اپنے بچے کو سناتی ہے۔ سماج کی ذہنی آسودگی کی ساری علامتیں اس میں سمٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے ادب پر یہی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

ادب کی دوسری قسم وہ تھی جو مسلم عوام کی نشأۃ الثانیہ اور وہابی تحریک کے تحت ملک کے طول و عرض میں پھیلائی جا رہی تھی۔ ثانی الذکر کا لکھنا اور پڑھنا دونوں ریاض کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لٹریچر نے لوگوں کو اُس جرأت رندانہ اور حدیث بیباکانہ کی رسم کو زندہ کرنے پر آمادہ کیا جو ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں جا کر دفن ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برصغیر کی تاریخ کا ایک انقلاب آفریں باب ہے۔ ہر طبقہ و خیال کے لوگوں نے اس انقلاب میں حصّہ لیا اور جی کھول کر اپنے خون سے ہولی کھیلی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی قسم کی تبدیلی یا انقلاب اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی ضرورت کا شدید احساس اور اس کے لئے بے پناہ جذبہ ہر ایک دل میں پیدا نہ ہو جائے۔ ایک ہندوستانی مفکر لکھتا ہے کہ[1]:-

---

[1] انقلاب، ایم۔ این، رائے۔

"یسوع مسیح کا انجام تمام انقلابیوں کا انجام ہے۔ ترقی
کے تمام نقیبوں کو سولی پر چڑھنا پڑتا ہے، ہم اپنے وقت
کی اسپرٹ کے نمائندہ ہیں اور یہ اسپرٹ ان تمام رکاوٹوں
کو ختم کر دیتی ہے جو عوام کی ترقی اور فلاح کی راہ میں
حائل ہوتی ہے۔

قومی ادب اس کے لئے فعّالی پارٹ ادا کرتا ہے، اس کے بیانیہ کی یہ تاثیر ہوتی ہے کہ عوام خرد کے ہر ایک مشورہ کو ٹھکرا کر انقلاب کی آگ میں کود پڑتے ہیں، آزادی کی دیوی شہیدوں کے مقدّس خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے، انقلابی ادب اور عام ادب میں بیّن فرق ہے۔ اوّل الذکر کے خالق کے ذہنی شعور پر ہمہ وقت ایک بے چینی اور کشمکش طاری رہتی ہے۔ یہ ہی اس کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ میں وہ جادو بھر دیتی ہے جو ایک پیغام بن جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل قومی لٹریچر نے جو مہتم بالشان کارہائے نمایاں انجام دئے وہ اب روشنی میں آ رہے ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اس عہد کے مفکروں، ادیبوں اور شاعروں نے کس قدر انتھک تحریری کام کیا تھا۔ انھوں نے مختلف رسائل اور کتابچوں کی صورت میں بیداری کا پیغام دیا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہونے کے لئے تیار رہیں۔ اس قلمی جہاد نے انگریز کے خلاف نفرت و حقارت کا جو بیج عوام کے دلوں میں بویا تھا اس کا عملی مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

وہی تبدیلی دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے جو دلوں کے اندر سے پیدا ہو

اس کے لئے محض جوش و خروش کافی نہیں ہوتا بلکہ انقلابی لٹریچر نے ذریعہ پہلے ذہنی تربیت کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں کی قلمی کاوشوں نے عوام کو ذہن نشین کرایا کہ باطل کے خلاف صف آرا ہونا اس لئے ضروری نہیں کہ چوں کہ ان سے ایسا کرنے کو کہا گیا بلکہ انھیں یہ سمجھ کر دعوتِ حق پر لبیک کہنا چاہیئے کہ یہ انسانیت کا پہلا فریضہ ہے اور آزادی ہر ایک فرد کا پیدائشی حق ہے، جو کوئی اس حق کو غصب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا از بس ضروری ہے، خواہ تلوار سے خواہ قلم سے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ کا ہر ایک پہلو عوام کے سامنے تھا اور وہ از خود فیصلہ کر رہے تھے کہ جس راہ میں قدم اٹھ چکا ہے اسے آگے کی سمت ہی بڑھتے رہنا چاہیئے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ جس محاذ پر انسانیت اور آزادی کی لڑائی لڑنے جا رہے ہیں وہاں انھیں زبردستی نہیں لے جایا گیا تھا۔ بلکہ خود ان کا مقصد عظیم اور ذوق یقین کشاں کشاں انھیں وہاں لایا تھا۔ باغی فوجوں میں شامل ہو کر مجاہد کہلانا ایک امتیازی نشان بن گیا تھا۔ ع

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

بالاکوٹ کے حادثہ نے بجائے مایوسی اور ہراس پیدا کرنے کے لوگوں کے دلوں کو مزید گرمانے کا کام کیا۔ وہابی تحریک کے تمام سرگرم کارکن بالخصوص مولوی یحییٰ علی اور جعفر تھانیسری وغیرہما نے جنگ آزادی کے لئے بہت زیادہ تحریری کام کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے آخر الذکر کی غیر معمولی قابلیت کو بہت سراہا ہے

انسانی فطرت اضداد کا مجموعہ ہے جہاں کسی نے اس کے اوپر کوئی فرد جرم عائد کی وہ اور زیادہ بھڑک اٹھی اب کس کی جرأت ہے جو اس کو دبا سکے۔ دیکھئے

بالاکوٹ کا حادثۂ فاجعہ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہاں کی سرزمین ہنوز شہیدوں کے لہو سے سرخ ہے۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے پیغام فضاؤں میں گونج رہے ہیں کہ آؤ اور اُس قربانی کی رسم کو عام کرو جو ہم قائم کر کے گئے ہیں۔ غاصبوں کا مقابلہ کرنے میں بازو شل اور ہاتھوں میں سکت باقی نہیں رہی ہے۔ تو کیا پرواہ۔ منصور و سرمد کی روایت کو زندہ کرنا تو کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ان کی قوم نے ۱۸۵۷ء میں ملک کے ہر ایک گوشہ میں بالاکوٹ کے نمونہ کے لاتعداد مقتل بنا ڈالے اور سر کٹا کر سرخ رو ہوئے کیوں کہ۔ ع

شوریدگی کے جوش سے سر تھا وبال دوش

حق بات لکھنے پر کچھ ہاتھ اس لئے قلم کئے گئے تھے کہ لوگ آئندہ کے لئے عبرت پکڑیں لیکن ہو گیا اس کے برعکس۔ اب ہزاروں ہاتھ وہی کچھ رقم کر رہے تھے جس کی پاداش میں یہ سزا تجویز ہوئی تھی۔ ان گنت بار کسی کے زور بازو کا تختۂ مشق ستم بننے کے باوجود ذوقِ گناہ ہے کہ بڑھتا جاتا تھا۔

ع کون کرتا ہے فدا تیغ پہ سر دیکھیں تو

مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے سلسلہ میں شاہ اسماعیل شہید کی تحریریں انقلابی ادب میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کی کتاب "تقویۃ الایمان" انقلابی ادب میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس میں انھوں نے "صراط مستقیم" کے برعکس ایک مجدد یا ریفارمر جیسا فہمائشی لب و لہجہ استعمال کیا ہے۔ مومن جیسا رنگین نوا

شاعران کے فیض صحبت سے ایسا متاثر ہوا کہ شوقِ شہادت کی آرزو کرنے لگا۔ ان کی مثنوی جہادیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

علمی صحبتوں کے لئے مفتی صدرالدین آزردہ کا دیوان خانہ مشہور تھا۔ انھیں اردو۔ فارسی عربی پر بخوبی دسترس حاصل تھی۔ ہر سہ زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نثر میں بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ان کا کتب خانہ اُس زمانہ میں تین لاکھ کی مالیت کا تھا۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں جائیداد کے ساتھ وہ بھی ضبط ہو گیا۔ مولوی عبدالقادر بر لاس لکھتے ہیں کہ :-

"جس وقت بندہ نے ان کو دیکھا تھا ان کی توجہ اشعار و
رسخنہ سے زیادہ کتبِ علمیہ کی جانب تھی۔"[1]

نمونتاً اُن کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

علمائے وقت مولوی لیاقت علی الہ آبادی غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے نظم و نثر دونوں پر کافی عبور تھا۔ "فرقۂ جہادیہ" کے نام سے ایک جماعت قائم کی تھی۔ اس کے مقاصد عالیہ کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں ان کے قلم گوہر رقم نے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ فضیلتِ جہاد پر دو اعلان نامے لکھے تھے۔ ایک نثر میں دوسرا

---

[1] "وقائع عبدالقادر" مرتبہ محمد ایوب قادری۔ (شایع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۵۸ء)

نظم میں[1]۔ سیاسی اور مذہبی امور میں ان کی اصابت رائے کافی اہمیت رکھتی تھی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی، اپنے زمانے کے علماء وفضلاء میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں علم معقول میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، پہلے کمشنر دہلی کے دفتر میں پیشکار رہے۔ پھر متعدد نوابوں اور راجوں کے یہاں رہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا۔

نتیجہ میں حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ کالے پانی میں بیٹھ کر "قصائد عذریہ" کے نام سے عربی زبان میں ایک منظوم داستان لکھی جو اثر انگیزی میں ڈوبی ہوئی ہے چند سطریں اس کے ترجمہ کی ملاحظہ ہوں۔

"ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اُٹھاتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اُٹھا رہے ہیں۔ ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل واحسان کا شکر گزار ہوں۔ وہی تو جابر فرعون سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے[2]"۔

منشی محمد اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی ایک قضیہ نامرضیہ میں کالے پانی پہنچے یاد وطن پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

---

[1] کالا پانی مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۲۴۶

[2] قصائد عذریہ ص ۱۶۸ منقول از "باغی ہندوستان" تالیف مولوی عبدالشاہد خاں شروانی۔ طابع مدینہ پریس بجنور۔

فرّخ آباد اور یارانِ شفیق ؒ

چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں ترقیس کی تصویر سے

مُراد آباد کے مولانا کفایت علی کافی نے تحریک کو چلانے کے سلسلے میں بہت زیادہ کام کیا۔ ان کا فتوائے جہاد ملّی حقوق کی بُنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس کو اُنھوں نے چھپوا کر بریلی۔ آنولہ۔ بدایون۔ شاہجہاں پور۔ اور دوسرے شہروں میں بھی تقسیم کرایا تھا۔

اس وقت کے چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں میں ان کا شمار تھا جب الوطنی کے الزام میں تختۂ دار پر چڑھے اور اپنی تازہ نعتیہ غزل پڑھتے ہوئے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کوئی گُل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا

نثر میں بھی کئی کتابیں لکھی تھیں[1]۔

ع۔ شہید حق پہ ہو رحمت خدا کی

---

[1] مولانا کافی شہید۔ از محمد ایوب قادری (العلم جنگ آزادی نمبر)

Taj Tahir Foundation

جنگ آزادی کے صاحبانِ سیف و قلم میں مولوی فیض احمد بدایونی کا نام نامی سرفہرست ہے۔ تصانیف کثیرہ کے مالک تھے۔ جو اس ہنگامہ میں ضائع ہو گئیں۔ علم کلام پر ان کا ایک رسالہ "تعلیم الجاہل" ہے۔ ان کے عربی قصائد ملتے ہیں۔ فتوائے جہاد پر ان کے بھی دستخط تھے۔ جنرل بخت خاں نے ان کو مرزا مغل کا پیشکار بنایا۔ دلّی کی شکست کے بعد مولوی صاحب بھی ان کے ساتھ روپوش ہو گئے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ اس مردِ حق پرست نے وطن کی سرزمین چھوڑ کر کون سی بستی جا بسائی۔ ع

تمھیں، وطن کی فضائیں سلام کہتی ہیں

مولانا ایک خوش فکر شاعر تھے ایک شعر ملاحظہ ہو۔[1]

؎ کرتا ہوں دیر اس لئے جاں دینے میں
مجھ کو پسند ہے کہ تقاضا کرے کوئی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ باعتبار علمی قابلیت دلّی کی ادبی صحبتوں میں جانِ سخن کی حیثیت رکھتے تھے۔ "گلشن بے خار" ان کا عظیم قلمی کارنامہ ہے۔ دوسرے رفقاء کے ساتھ یہ بھی معتوب اور مقہور ہوئے۔ بجرم حق پژوہی قید و بند کی سزا بھگتی اور جاگیر ضبط ہوئی اردو فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مصطفیٰ خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے

---

[1] مولانا فیض احمد بدایونی از محمد ایوب قادری۔

درمۂ جیسِ ہفت سالہ کی تاب اس نازپرورده میں کہاں"

امام بخش صہبائی کا شمار دلی کے فاضلِ اجل لوگوں میں تھا۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ حدائق البلاغت۔ انتخاباتِ نظم اردو۔ قواعد اردو۔ وہ ایک اچھے اور کامیاب شاعر تھے۔ وہ دہلی کے دولڑکے توپ سے اڑائے گئے۔ لاشیں دریا میں پھنکوادی گئیں۔ مولوی لیاقت علی۔ مولوی سرفراز علی۔ منیر خاں جہادی۔ ڈاکٹر وزیر خاں۔ مولوی امام خاں۔ مولوی عبدالغفور۔ مولوی احمداللہ شاہ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے لئے عوام کو تیار کیا۔ مولوی احمداللہ شاہ جب وعظ کہتے تھے تو دس دس ہزار کا مجمع ہوتا۔ لیکن لوگوں کے استغراق کا یہ عالم ہوتا کہ سوائے سانسوں کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مولوی سرفراز علی نے فوجوں میں تحریک کو پھیلانے کے سلسلہ میں زبردست کام کیا۔ جہاں بھی جاتے پہلے درس وتدریس دینا شروع کرتے جب لوگ ان سے کچھ مانوس ہوجاتے تو یہ ان سے جہاد پر بیعت لیتے تھے۔ ان کے اس عجیب وغریب طریقہ کو غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی۔ اور ان کے دوسرے ساتھی اس طریقہ پر اپنے اپنے علاقوں میں تحریک کا پروپیگنڈہ کرتے تھے۔

مولوی خرم علی بلہوری نے دو کتابیں نصیحۃ المسلمین اور رسالہ جہادیہ شائع کیں۔ مولوی ولایت علی نے رسالہ "دعوت" اور رسالہ "شرک" ۱۸۵۲ء میں چھپوا کر پورے ملک میں تقسیم کیا۔ مولوی عنایت علی نے رسالہ "بت شکن" لکھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سرگرم کارکنوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مجاہدین کے ایک دستے کی زمانۂ جنگ میں قیادت بھی کی تھی۔ ہنگامہ فرو ہوجانے اور شکست

پاجانے کے بعد بھی مولانا عنایت علی کی مجاہدانہ اسپرٹ میں کمی نہیں ہوئی ۱۸۵۸ء میں جنرل سکاٹن نے مجاہدین پر پشاور سے حملہ کیا تو انھوں نے خوب داد شجاعت دی۔ شومئی قسمت نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ بڑی تعداد میں لوگ شہید ہوئے۔ عنایت علی صاحب نے ستھانہ کا رُخ کیا راستہ میں بمقام چمپئی انتقال ہوگیا۔ عزم و ارادہ کہاں تک ساتھ دیتا۔ ع

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

صاحبِ سیف اور صاحبِ قلم مجاہدوں میں بریلی کے نواب خان بہادر خاں شہید کا نام بھی قابلِ ذکر ہے مصروف تخلص تھا نمونۂ کلام یہ ہے۔

تا حشر اب خیال نہ میرا کرے گا دل
تو اس کو مل گیا تو مرا کیا کرے گا دل
مصروف دیکھ پیروئ دل نہ کیجیو،
میری طرح سے تجھ کو بھی رسوا کرے گا دل

نثر میں بھی ایک کتاب "مقاصد الصالحین" کے نام سے لکھی تھی۔

مرزا عاشور بیگ ثنائی دہلوی علوم ریاضیات۔ ہیئت و ہندسہ کے علاوہ فن نجوم و رمل میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ جنگ آزادی میں دو پلٹنوں کو لے کر شہر سے باہر نکلے بانک برلیت پر گوروں سے مقابلہ ہوا انھیں شکست فاش دی کئی چھکڑے مال غنیمت لے کر واپس آئے۔ دلّی سے کوچ کرتے وقت فرنگیوں کی گولی کا نشانہ بنے۔

تحریک کی ابتدا ہی سے ملک کے طول و عرض میں کثرت سے نصاریٰ کے

خلاف فتوے شائع ہو رہے تھے۔ لیکن بہادر شاہ ظفر اور جنرل بخت خاں کے اعلانات اس سلسلہ میں جذبات کو برانگیختہ کرنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا ہر لفظ دعوتِ فکر سے بھرپور تھا۔ شاہ ظفر کے جہاد نامہ، کو مولوی قطب شاہ نے مطبع پہادری بریلی سے شائع کرایا اس کی طویل عبارت میں سے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"ان لوگوں کو جو تمہارے مذہب کو بگاڑنا چاہتے ہیں
نیست و نابود کر دو۔ اہلِ ہنود کو گنگا جی اور تلسی سالگ رام
کی قسم ہے اور مسلمانوں کو قرآن مجید کی قسم ہے کہ وہ
بالاتفاق شامل ہو کر اپنی جان اور ایمان کی حفاظت کے
واسطے انگریزوں کا قتل اپنے ذمہ فرض سمجھیں۔ اگر وہ
ایسا نہ کریں گے تو خدا کی نظر میں گنہگار ہوں گے۔"

۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ کا دوسرا جہاد نامہ شائع ہوا۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔

مذکورۂ بالا اعلان شاہی کے برعکس جنرل بخت خاں کے ایک استفتاء کا انداز بیان زیادہ انقلابی ہے جو جولائی ۱۸۵۷ء کو "صادق الاخبار دہلی" میں شائع ہوا تھا۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب انگریز
دلی پر چڑھ آئے ہیں۔ اس صورت میں شہر والوں پر جہاد
فرض ہے یا نہیں؟ بیان کرو اللہ جزا دے۔"

اس کے جواب میں جو فتویٰ شائع ہوا۔ اس پر اُن تمام مجاہد علما کے دستخط تھے جو اس وقت دلی میں انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔ حیرت اس امر پر ہوتی ہے کہ جنگ آزادی کی تحریک مسلسل ایک سال تک ملک کے طول و عرض میں جاری رہی اس کے سربراہ خاصے پڑھے لکھے لوگ تھے جن میں سے اکثر و بیشتر صاحبِ تصنیف بھی تھے لیکن آج ان کے کلام و بیان کا وہ حصہ جو غدر سے متعلق تھا اور خیال ہے کہ جس کا بیشتر حصہ اردو میں تھا۔ تقریباً ناپید ہے۔ انگریز مصنفین کی متفرق شہادتوں اور بیانات نیز روزنامچوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انقلابی لوگ بھیس بدل کر اضلاع میں نکل جاتے اور جہاد سے متعلق لٹریچر تقسیم کرتے۔ وہ اس میں کیا رقم کرتے۔ ان کی یہ اپیلیں نظم میں ہوتیں یا نثر میں۔ ان کا پیرایہ بیان کس قسم کا ہوتا بجز چند متفرق تحریروں اور فتووں کے مزید متعلقہ مواد ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اس قدر ہمہ گیر اور منظم سازش صرف ہتھیاروں کے بل تو چلائی نہیں جا سکتی تھی۔ یقیناً اس کمی کو لوگوں نے قلم سے پورا کیا ہوگا۔ ورنہ اس محاربہ عظیم کا اس قدر منظم طریقہ سے وقوع پذیر ہونا امر محال تھا۔ تحریک کو چلانے والے علما اور دوسرے رہنما مثل عظیم اللہ خاں اور نانا راؤ پڑھے لکھے اور اعلیٰ علمی قابلیت کے لوگ تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے تلوار سے زیادہ قلم سے کام لیا ہوگا۔ انگریز مورخوں نے ان کی دماغی صلاحیتوں اور اعلیٰ ترین ذہانت کا بارہا اعتراف کیا، بلکہ اکثر نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اس تحریک کا دماغ عظیم اللہ خاں تھے اُنھوں نے اور نانا راؤ نے والیانِ ریاست کو جو پیغامات لکھے تھے ان میں فرنگیوں کی عیاریوں اور فریب کاریوں کا حال کھولا ہے۔ یہ پیغامات الحاقِ اودھ سے بھی

تین ماہ قبل بھیجنا شروع کر دئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک پیغام انگریزوں نے میسور میں پکڑا ۱۸۵۷ء کے اوائل مارچ میں عظیم اللہ خاں کے ہمراہ نانا راؤ دلّی گئے، لال قلعہ میں بادشاہ سے کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔ آپس میں کیا کیا باتیں ہوئیں کون کو خدا جانے یا دیوانِ خاص کے بام و در۔ کان پور شہر کا انتظام کرنے کے لئے جو سات آدمیوں کی کمیٹی بنی تھی اس کے تحت ایک عدالت قائم ہوئی جس کے جج عظیم اللہ خاں تھے۔ جہاں تک بیرونی روابط کا تعلق تھا یہ سب عظیم اللہ خاں کر رہے تھے۔ چندر نگر کے فرانسیسیوں کو انھوں نے انگریزوں کے خلاف خط لکھے، نیز قسطنطنیہ کے عمر پاشا کو بھی انھوں نے لکھا جس میں اپنے یہاں کی ملکی ابتری اور بے چینی کے حالات درج کئے تھے۔ انگریز نے ہنگامے کے حالات کو نسیاً منسیاً کرنے کے لئے دفینوں کے ساتھ باغیانہ لٹریچر کی بھی تلاش جاری رکھی اور جو متعلقہ تحریریں ہاتھ آئیں ان کو ہفتوں اور مہینوں تک چلاتے رہے۔

عظیم اللہ خاں نے انگلستان وغیرہ کا بھی دورہ کیا۔ ۱۸۵۶ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ پوری اسکیم انھوں نے انگلستان بیٹھ کر مرتب کی اور اس کو یہاں لاکر تمام باغی لیڈروں مثلاً جنرل بخت خاں۔ فیروز شاہ۔ احمد اللہ شاہ۔ اور لیاقت علی وغیرہ کو دکھائی اور ان سے تبادلۂ خیال کیا۔

محبانِ وطن کی ان تمام کوششوں کو جو انھوں نے غلامی کی بیڑیاں کاٹنے کے لئے کی تھیں چھپے ہوئے دبیز پردوں میں سے نکالنے کا کام ہنوز باقی ہے۔ ان کی زندگی اور شہادت دونوں ہمارے لئے سبق آموز ہیں اور ہمیں صراطِ

مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے رہیں گے۔ بالآخر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو گیا۔ شاہ ظفر رنگون جلاوطن کر دئے گئے۔ قلعہ کے بام و در ہاں کی جدائی میں ہمیشہ کے لئے نوحہ کناں رہ گئے۔ ان کی جانِ ناتواں نے جو مصائب جھیلے ان کی آنکھوں نے جو دل دوز مناظر دیکھے اس کو برداشت کر لینا انھیں کا حصہ تھا حیف صد حیف اپنی غریب الوطنی کو کیسے دل دوز طریقہ پر بیان کرتے ہیں :۔

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

شہنشاہ ہند وطن کی دو گز زمین کی آرزو لئے دنیا سے رُخصت ہوئے۔ سچ ہے ؎

نہ گل چمن میں رہیں گے نہ گل میں بو باقی
یہ سب تجھی پہ مٹیں گے رہے گا تو باقی

دلّی کے سارے ایوانِ علم و ادب بند ہو چکے ہیں اور ان کے دروازوں پر پہرے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ مفتی صدرالدین آزردہ کا دیوان خانہ ہے۔ یہاں ان کا علمی دربار جمتا تھا۔ اصنافِ شعر و ادب کی وہ کون سی شق باقی تھی جس پر سیر حاصل بحث نہ ہوتی ہو۔ ان کی مسند خالی پڑی ہے۔ مسلمان ہونا باغی ہونے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ہر ایک پڑھے لکھے۔ سمجھدار شخص پر باغی ہونے کی فرد جرم لگی ہوئی ہے۔ اُن کو اگر دیکھنا ہو تو مجرموں کے کٹھیرے میں کھڑا ہوا ملے گا یا مقتل میں کشتۂ ستم

Taj Tahir Foundation

نظر آئے گا۔ جو لوگ اس گردش لیل و نہار کے چکر سے بچتے ہیں انھیں سمیٹ کر کالے پانی لے جایا جا رہا ہے۔ فرشتۂ اجل ان کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہائے کیسے کیسے آئمہ روزگار جو صدیوں میں جا کر کسی ملک میں پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی موجودگی اس امر کی علامت سمجھی جاتی ہے کہ وہ قوم زندہ ہے قزلباشوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

یہ مولوی یحییٰ علی صاحب ہیں، وہابی تحریک کا سرچشمہ کہلاتے ہیں اور باعتبار علوم عقلی و نقلی شاہ شہید کے ہم پلہ مانے جاتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی قابلیت کا ہنٹر نے بارہا اعتراف کیا ہے۔ ان کی تحریر و تقریر کا دشمن اور دوست سب لوہا مانتے تھے۔ تذکرۂ صادقہ میں ہے کہ جیل میں ان کو رہٹ چلانے کے کام پر لگایا گیا تھا۔ جس سے صاحب موصوف کو خون آنے لگا تھا۔ کالا پانی ان کا آخری مدفن بنا۔ کیسے کیسے گراں مایہ افراد اس کی آغوش میں سما گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

تاریخ کا یہ آخری باب اختتام پذیر ہوا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں ایک قوم رنجور و مہجور و مقہور و لاچار بستی ہے اس کا نام مسلمان ہے۔ جلاوطنی اور پھانسی سے جو لوگ بچ گئے ہیں انھوں نے گوشے پکڑ لیے ہیں جس حال کو پہنچ چکے اس کا اجرٹن صاحب حاکم شہر دہلی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

"آج پھر عمائدین شہر میرے پاس آئے ڈرتے ڈرتے ڈرتے آتے ہیں تلواریں گلوں میں بندھی ہوئی جوتے برآمدے کے باہر اتار دیے ہیں۔ گردن جھکائے

آنکھیں نیچی کئے کھڑے رہتے ہیں۔ معاملہ جامع مسجد کا تھا۔ عجیب قسم کے لوگ ہیں۔ ان کے اپنے حالات بے حد خراب ہیں۔ ہزاروں مارے گئے اور لاکھوں بے گھر ہو گئے پھر بھی مسجد کا قضیہ ختم نہیں ہونے دیتے۔[1]

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کی ادبی اور تعلیمی خدمات

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے متعلق کوئی بھی بات شروع کی جائے۔ خواہ وہ اصلاح مذہب و معاشرت کی ہو یا تعلیمی اور سیاسی سرسید کی شخصیت اس پورے عہد پر اس طرح سے حاوی ہے کہ ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ لیکن مقطع میں یہ سخن گسترانہ بات آپڑی ہے کہ ہم اپنے موضوع کی رعایت سے صرف ان کی ادبی اور قلمی خدمات کا تذکرہ کریں۔

سرسید کے سوانح نگاروں نے ان کے تصنیفی اور تالیفی زمانہ کے تین ادوار قائم کئے ہیں۔ لیکن انسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ پہلا دور ۱۸۳۹ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۵۷ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا ۱۸۵۷ء تا ۱۸۹۸ء ہے۔

"۱۸۳۹ء میں سرسید نے ایک دفتری دستور العمل مرتب کیا جو اس قدر مفید و بہتر تھا کہ اس پر عمل کرنے

---

[1] ماہ نو کراچی ۱۸۵۷ء جنگ آزادی نمبر علاوہ بریں غالب کے خطوط دلی کی خونچکاں داستان اور اس کے مرثیے سے بھرے پڑے ہیں۔

کے لئے سرکاری ہدایات جاری ہوئیں۔ ۱۸۵۴ء میں "جامِ جم" لکھی امیر تیمور سے لے کر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کی ۷ خاندانوں میں جدولی تاریخ ہے[1]۔

مذہبی تصانیف میں "جلاء القلوب" ان کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ "کلمۃ الحق"، "راہ سنت و ردِّ بدعت" بھی مذہبی موضوع پر ہیں، ان سب پر "آثار الصنادید" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً چالیس کتابیں مختلف تعلیمی۔ مذہبی۔ تاریخی، سیاسی مباحث پر لکھیں یا ترجمہ کیں۔ بے شمار مضامین اس کے علاوہ ہیں ان کی تعداد چھ ہزار صفحات سے کم نہ ہوگی[2]۔

دورِ ثانی کا آغاز ان کی نہایت معرکۃ الآرا کتاب "تبئین الکلام" سے ہوتا ہے۔ یہ انجیل کی تفسیر تھی۔ اس میں اسلام کی حقانیت کو اسی کتاب مقدس سے انھوں نے ثابت کیا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اردو ادب کی ترقی کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ سرسید کی تمام تصانیف میں واقعیت نگاری پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اردو ادب میں سہل اور آسان الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو قاری کے ذہن نشین کر دینے کا ایک نیا اسلوب انھیں کا رائج کردہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگاری کا ملکہ قدرت نے انھیں وہبی طور پر عطا کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اگر وقوع پذیر نہ ہوتا اور ان کی سرگرمیاں صرف زبان و ادب ہی تک محدود رہتیں تو ان کا

---

[1] تذکرہ سرسید۔ ص ۲۳۲ محمد یٰسین زبیری مرحوم۔

[2] سرسید کا علمی کارنامہ از قاضی اختر جوناگڈھی۔ شائع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

شمار دنیا کے صف اوّل کے اہلِ قلم ادیبوں میں ہوتا۔ جب فکری اور تخلیقی اثاثہ مختلف اصناف میں بٹ جاتا ہے تو کسی عظیم آفاقی ادب کی امید عبث ہو جاتی ہے سرسید نے بارہا کہا کہ "جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا کسی کام میں نہیں لگتا" لیکن قدرت انھیں منصب امامت کے لئے چن چکی تھی۔ مجدد مصلح یا ریفارمر کے لئے صرف ادب کی لائن کیسے موزوں ہوتی۔ نگہ کی بلندی اور دلِ پرسوز پر صرف میرِ کارواں کا حق ہوتا ہے جو وافر طریقہ پر ان کے حصّہ میں آیا تھا۔ ملّت آخری بار سنبھالا لے رہی تھی موت اور زندگی کے درمیان وہ کوہِ گراں بن کر سینہ سپر نہ ہو جاتے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ مسلمان نام کی کوئی قوم برصغیر میں رہتی تھی بجز ان آثار و صنادید کے جو یہاں کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے تھے۔

دنیا میں آج تک جس قدر انقلابات رونما ہوئے ان کے دو رخ رہے ہیں اگر وہ کامیاب ہو گیا تو زندگی کے سارے خشک سوتے سیراب ہونے لگتے ہیں۔ ان میں حیرت انگیز بالیدگی اور توانائی آجاتی ہے سود و زیاں کے جن خدشات اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی جس کیفیت میں انقلاب کا پودا پروان چڑھتا ہے وہ سب پاور ہوا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی ناکامیابی طویل و تلخ نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ ہر ایک قدم پر احساس شکست خوردگی، غیر یقینی حالات، مستقبل ظلمت کے پردوں میں چھپا ہوا۔ اور نشان راہ کا کہیں کوسوں پتہ نہیں ہوتا۔ زندگی منفی پہلوؤں کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے مسلمانوں پر قیامت صغرا نازل تھی، زمین تنگ آسمان دور تھا۔ زندگی کی راہوں سے جو اسے مرتبہ نکالے گئے تھے۔ برق و خرمن نہ جانے کتنی بار ہمارے آشیانوں پر گری اور انھیں جلا کر خاکستر کیا لیکن اب کی مرتبہ بگڑنے کے انداز ہی کچھ دوسرے

تھے۔ فلک جفا پیشہ کو ضد تھی کہ مٹیے ہیں تو اس طرح سے مٹیں کہ پھر نہ اٹھیں۔

ع۔ مری بربادیوں کے مشورے تھے آسمانوں میں

تاریخ کا یہ ہولناک المیہ سرسید کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا۔ انھوں نے لاتعداد عزیزوں دوستوں اور اپنے ہموطنوں کو کیسے کیسے روح فرسا حالات میں گذرتے دیکھا یہ انھیں کا جی جانتا ہوگا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو زیست ماتم گساریوں سے سر نہ اٹھاتا۔ لیکن آفریں ہے ان کی ہمت بلند پر۔ تیغ براں کے ہر ایک وار کو کیسی جی داری سے سہ گئے۔ اور ملت کے جسم مردہ میں نئی روح پھونکنے کی دھن میں لگ گئے۔ ع

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ان دنوں ان کے دل پر کیا بیت رہی تھی اس کا اندازہ "سراب حیات" کے مضمون سے ہو سکتا ہے سرسید لکھتے ہیں کہ۔

"میں دل بہلانے کے لئے اپنے باغ میں گیا۔ اور ولولہ کے زمانہ میں میں نے اس کو از سر نو نہایت خوبصورت و خوشنما آراستہ کیا تھا۔ وہاں اکثر دوستوں اور بڑے بڑے نامی باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالب کی دل کش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے آزردہ کی دل چسپ و دلربانہ یا فصاحت سے شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے صہبائی جاں نواز کے میخانہ صحبت سے دل شاد کام

Taj Tahir Foundation

رہتا تھا۔[1]

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں کہ :-

"یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں کجا وہ مجلسیں کہاں وہ آزردہ کہاں وہ شیفتہ۔ غالب اور مومن کہاں۔ وہ ضہبائی کہاں صرف یاد ہی یاد باقی ہے۔"[2]

جب تک دلی میں قیام رہا مفتی صدرالدین آزردہ کا دیوان خانہ جو علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ سرسید روزانہ وہاں حاضری دیتے رہے۔ وقت کا کوئی سا مرہم ان علمی صحبتوں کے اجڑنے کے بعد اس زخم کو مندمل نہ کر سکا جو ان کے دل پر لگا۔ ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ :-

"میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں تھا۔ امید نہیں تھی کہ قوم پھر عزت پائے گی جو حال اس کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز اسی غم میں رہا۔ میں بوڑھا ہو گیا اور میرے بال سفید ہو گئے، مراد آباد آیا۔ جو ایک الم کدہ ہمارے رئیسوں کا تھا تو اس غم میں اور ترقی ہوئی۔"

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد دوم

[2] سرسید کا علمی کارنامہ۔ اختر چوناگڈھی مرحوم۔

Taj Tahir Foundation

مسلمانوں کی اس دگرگوں حالت کو دیکھ کر بھی انگریز کے جذبۂ انتقام کی سیری نہ ہوتی تھی ؎

اِدھر یہ ناتوانی ہے ادھر وہ بدگمانی ہے
نہ بولا جائے ہے مجھ سے نہ پوچھا جائے ہے اس سے

سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر (یو۔پی) نے لکھا کہ:۔

"لوگوں کی عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف خیال کرتے ہیں لیکن اگر کسی عالی نسب شیر پر زخم لگایا جائے تو وہ کیسا ہی ضعیف بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ اور جست کرے گا"[1]

اسی دوران میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے سمندنا زیر تازیانہ کا کام دیا کتاب کا نام تھا:۔

"کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے مذہب ملکہ سے بغاوت فرض ہے"

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنے ہم وطنوں کو باور کرایا تھا کہ مسلمانوں کا مذہب اور تہذیب اس بات کے موجب ہیں کہ وہ کافر فتح مندوں کی طرف سے بغض و عداوت اپنے دلوں میں رکھیں، نیز اس نے مسئلہ دارالحرب پر بھی ایک طویل بحث کی تھی

---

[1] روشن مستقبل صـ۳۲۵ مولانا طفیل احمد مرحوم۔

اور لکھا کہ :-

"مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیر خواہی
اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے"

سرسید مذکورہ بالا پریشان کن صورت حال سے خاصے بے چین تھے۔ فاتح کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ازبس ضروری تھا۔ اس کے لئے انھوں نے قلم کا سہارا پکڑا اور اپنی مشہور کتاب "اسباب بغاوت ہند" لکھنے میں مشغول ہو گئے مسلمانوں کی مدافعت میں ایک مسلمان کا آواز اُٹھانا ان کی جرات و بے باکی کا مثالی نمونہ تھا۔ لکھتے ہیں کہ :-

"سرکشی کا ارادہ جو دل میں پیدا ہوتا ہے اس کا
سبب ایک ہی ہوتا ہے پیش آنا ان باتوں کا جو مخالف
ہوں ان لوگوں کی طبیعت، طینت اور رسم و رواج
سے جنھوں نے سرکشی کی۔ نوکر یا رعیت کا اپنی گورنمنٹ سے
لڑنا اور مقابلہ کرنا سرکشی ہے"[1]

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں کہ :-

"مگر ان فسادوں کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور صداقت
سے انھیں بیان کرنے میں ایک عمدہ خیر خواہی گورنمنٹ
کی سمجھتا ہوں اس لئے میرے اوپر واجب ہے کہ ان کو
ظاہر کر دوں"

---

[1] اسباب بغاوت ہند صـ ۱۳

بلاشبہ گورنمنٹ کو معلوم نہیں تھا کہ رعیت کس مصیبت میں مبتلا ہے رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے تھے جو ایک ادنی تحریک سے دفعتاً اُبل پڑے۔

پہلا سبب بغاوت کا سرسید کے خیال میں یہ تھا کہ رعایا ہر ایک ملکی انتظامیہ کی تجاویز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی تمام لوگ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرنے کا ہے۔

۱۸۳۷ء میں زبردست قحط پڑا سارے یتیم بچے عیسائی مشنریوں کے سپرد کر دیئے گئے اُس وقت عام خیال یہ پھیل گیا کہ پورے ہندوستان کو مفلس اور محتاج کر کے مذہب تبدیل کرا دیں گے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اوطاع ملک میں جب کسی جگہ فتح ہوتی تو سب کمال رنجیدہ ہوتے۔ صاحب لوگ اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری کا وعظ سنو۔ کثرت سے مشنری اسکول جاری ہوئے۔ جن میں کھلے ہندوؤں مذہب عیسوی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

"یہ باتیں سب کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو زیادہ گراں گذرتی تھیں صدہا سال سے وہ ہندوستان میں باعزت چلے آتے ہیں، ان کی طبیعت میں غیرت اور روپیہ کا لالچ بہت کم ہے"

اعلیٰ عہدہ جات پر ان کی ترقی نہیں ہوتی تھی۔ بہت ہی کم زمانہ گذرا ہے کہ یہ معزز تھے ان کا عزم و ارادہ

اب بھی ویسا ہی ہے"

مولانا طفیل احمد صاحب رقمطراز ہیں کہ:۔

"اسباب بغاوت ہند" کمپنی کی صد سالہ حکومت کی صحیح اور مکمل تصویر ہے۔ سیاست پر ایک ہندوستانی کا سب سے پہلا رسالہ تھا۔ جو توپ کے منہ کے سامنے ایک ملازم سرکار نے لکھا"

اس سلسلہ میں ان کی پہلی کتاب "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" ہے۔ اس میں صرف ضلع بجنور کی بغاوت کے حالات قلمبند کیے ہیں اور انھوں نے بغاوت کا سارا الزام انقلابی لیڈر محمود خاں پر رکھا ہے۔ عام مسلمانوں کی برّیت کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

لکھتے ہیں کہ:۔

"کئی روز سے بریلی کی ڈاک بند تھی اور اسی سبب سے ہم لوگ نہایت متردّد اور فکرمند تھے اس وقت سارے اضلاع کی نظر بریلی پر تھی۔ تمام نمک خوار اور پنشنی تابعدار محمود خاں کے حق میں تھے"

رسالہ اسباب بغاوت ہند کا اچھا اثر ہوا۔ بالخصوص انگلستان کے نیک دل اور شریف انسانوں نے مسلمانوں کے معاملہ میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے طرز عمل کو قابلِ اعتراض قرار دیا۔ ۱۸۵۷ء میں ایک نیم ماہی رسالہ "خیر خواہ مسلمانان ہند" کے نام سے جاری کیا۔ اس کے پہلے نمبر میں لکھتے ہیں کہ:۔

Taj Tahir Foundation

"کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں ہوئی ہو
اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ ان دنوں جو
اخبارات میری نگاہ سے گذرے اور جو کتابیں
اس ہنگامہ کی نسبت تصنیف ہوئیں ہر ایک میں یہ ہی
لکھا ہے کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات مسلمانوں کے
علاوہ کوئی نہیں۔"[1]

اس رسالہ کا ایک کالم انگریزی میں ہوتا تھا اور زیادہ تر حکام میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

ایک دوسرا رسالہ لفظ تحقیق نصاریٰ میں لکھ کر شائع کیا جس میں قرآن مجید سے ثابت کیا کہ نصاریٰ کا لفظ عیسائی خود اپنے لئے استعمال کرتے تھے۔ اپنی تحریروں میں جس کسی نے لفظ نصاریٰ لکھا تھا۔ اس پر عبرت انگیز سزائیں دینے کا سلسلہ ایک عرصۂ دراز تک چلتا رہا تھا۔

۱۸۶۳ء میں ایک علمی ادارہ "سائنٹفک سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا مقصد اس کا یہ تھا کہ مسلمانوں میں مغربی علوم سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ ۶ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو کلکتہ کی مجلس مذاکرہ میں اس کے مقاصد پر ایک مفصل لکچر دیا۔ ۱۸۶۶ء میں ایک اخبار "انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے نام سے جاری کیا۔ ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" ایک اور رسالہ کا اجرا کیا۔ سات سال تک

---

[1] تذکرۂ سرسید ص ۱۹

اس پرچہ نے اُردو ادب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اس کے آخری نمبر میں سرسید رقمطراز ہیں کہ :۔

"اُردو زبان کا علم و ادب جو بد خیالات اور موٹے بھدے الفاظ کا مجموعہ ہو رہا تھا۔ اس میں جہاں تک ہو سکا اصلاح چاہی ۔ علم و ادب کا ترقی پانا ہماری مرادیں تھیں۔ اس میں اُردو کو نئے طرز کے سانچوں میں ڈھال کر عام فہم زبان لکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ وہ پہلا ادبی پرچہ تھا جس میں مسجع اور مرصع عبارت لکھنے سے احتراز کیا گیا تھا۔"

۱۸۵۷ء کے بعد ان کی طرزِ نگارش میں ایک خاص قسم کا سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں اُنھوں نے "اینگلو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی اس کے سالانہ اجلاس میں جو صدارتی خطبات اور مقالے پڑھے جاتے تھے وہ بھی تاریخ و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ادب کے علاوہ سرسید نے جو دوسری تعلیمی، سیاسی اور اصلاحِ معاشرت کی وقیع خدمات انجام دیں۔ برصغیر کی تاریخ میں وہ سنہرے حروف میں ثبت ہو چکی ہیں۔ اس کے لئے قوم ان کی روح پاک پر ہمیشہ عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کرتی رہے گی۔ ان کا زندۂ جاوید کارنامہ نہ صرف علی گڑھ کالج (مسلم یونیورسٹی) ہے بلکہ اسی کے نمونہ کی وہ بلاتعداد تعلیم گاہیں اور ادارے

ہیں جداسی انداز پر۔ ایک کے طول و عرض میں ان کے مکتبۂ خیال کے لوگوں نے قائم کئے ہیں۔

سرسید کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر ضروری ہے چاہے ان کے متعلق ایک ایک جملہ ہو۔

(۱) سیدالاخبار کا اجرا اور اس میں سرسید کی شمولیت۔

(۲) انگلستان کا سفر، اور وہاں کے تعلیمی نظام کو دیکھنا اور اس انداز پر کالج قائم کرنا اور ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا جواب خطبات احمدیہ اور ان کو انگریزی میں شائع کرنا۔

(۳) قرآن کی تفسیر۔

Taj Tahir Foundation

باب ششم

پنجاب میں اُردو

دل دادگانِ اُردو کے لئے یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ ان کی زبان اب دنیا کی دوسری زندہ زبانوں کی صف میں بیٹھی ہوئی ماہرینِ لسانیات کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ کبھی دکن والے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ کسی کی رائے ہے کہ اس کی جنم بھومی ولی ہے جہاں وہ برج بھاشا کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی۔ گجرات والے کہتے ہیں کہ اُردو کے سب سے پہلے شاعر ولی گجراتی ہیں۔ اہلِ اودھ مصر ہیں کہ اُردو کو ہم نے اہلِ علم کی زبان بنایا۔ اور اس میں نازک مضمون آفرینیاں پیدا کیں۔ پنجاب والوں کا کہنا ہے کہ اردو کا اصلی وطن پنجاب ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایجاد و اختراع کی ہر ایک روایت برحق۔ لیکن اس معاملہ میں کوئی

ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ تہی دستی و تہی دامانی کے باوجود یہ منزلت "نہ ہے قسمت"

وہ ظالم جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

ماہرین لسانیات کے دربار میں حرافہ دائر ہے دیکھئے تاج مرصع کس کے سر پہ رکھا جائے گا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اب تک جو تحقیقی کام ہو چکا ہے اس کا بھی تجزیہ ضرور ہے۔ بالخصوص جناب حافظ محمود شیرانی نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر تاریخ ادب اردو کے باب میں جو نئے انکشافات کئے ہیں اُن پر غور و خوض کرنا بے حد ضروری ہے۔ ان کی عالمانہ شخصیت ہمیں اپیل کرتی ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کو کان دھر کر سنیں اور ان کی ژرف نگاری پر غور و تعمق کی نظر ڈالیں۔ جہاں تک اردو کی مقبولیت اور وسعت کا تعلق ہے انکار و آرا کے اس ہجوم سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن زندہ زبان قطرہ سے گوہر بننے تک نشیب و فراز سے گذر کر جو مقام حاصل کر لیتی ہے اس کے مولد و منشا کے مسئلہ کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔

وقت کے تغیر و تبدل نے ہمیشہ سب سے پہلے زبان اور کلچر کو متاثر کیا ہے۔ انقلاب اندرونی ہو یا بیرونی اس کلیہ میں استثنا نہیں ہوا۔ فاتح اور مفتوح کے اختلاط کے نتیجہ میں بالضرورت ایک نئی زبان کی اساس پڑی اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے نئے الفاظ، تشبیہیں اور استعارات وضع کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلی جو اسے مشکل پیش آتی ہے وہ مقامی بولیوں سے مقابلہ ہے، نئی زبان کے خالق جس قدر ذہانت اور توجہ صرف کر کے اس کو صوری اور معنوی حیثیت سے حسین و دل کش بنانے کی کوشش کرتے ہیں اسی سرعت سے عوام میں مقبول ہوتی ہے۔ اس کا پرکشش انداز بیان لبھانے والے

متنوع الفاظ اجنبیت کے سارے حجابات کو ایک ایک کر کے ختم کر دیتے ہیں اور علاقائی زبان اس میں اس طرح سے ضم ہو جاتی ہے کہ اُس کا علیحدہ وجود قریب قریب ختم سا ہو جاتا ہے۔ غیر تو غیر اپنے بھی اس زبان میں اظہار خیال کرنے سے احتراز کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جو زبان مقامی زبان کی جگہ لیتی ہے اُس پر مقامی رنگ کی تھوڑی بہت چھاپ ضرور لگی ہوتی ہے اور اس کے مولد و ملجا کا پتہ لگانے میں یہ چیز اساس کا کام دیتی ہے چنانچہ دورِ طفولیت کی اجنبی زبان علاقائی بولیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ دیکھئے ابتدائی اُردو میں سندھی اور پنجابی کا رنگ غالب ہے اور یہ چیز اُس کا اصلی وطن پنجاب بتلانے میں مدد دیتا ہے۔ محمود شیرانی مرحوم اپنی کتاب پنجاب میں اُردو، میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اُردو کی وضع قطع اور ڈھنگ برج بھاشا سے بالکل مختلف ہے قواعد و ضوابط ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اردو ایک حد تک پنجابی سے اور اس سے زیادہ ملتانی سے مشابہ ہے"

ان کے اس دعوے پر علمی حلقوں میں کافی چہ می گوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ بالخصوص دلّی اور لکھنؤ کے اہل زبان نے بہت برا مانا لیکن جہاں تک نفسِ معاملہ کا تعلق ہے شیرانی صاحب کا شمار چونکہ برصغیر پاک و ہند کے چند گنے چنے اہل قلم میں ہوتا ہے اور ان کی بات بطور سند کے تسلیم کی جاتی ہے۔ لہٰذا اُن کے پیش کردہ دلائل بھی کافی وزن رکھتے ہیں فرماتے ہیں:۔

"ایران میں لفظ اُردو سلاطین کی فرودگاہ یا

کیمپ کے معنی میں تھا۔ ہندوستان میں اس لفظ کا
استعمال بابر کے عہد سے شروع ہوا۔ اردو میں جو کتابیں
تصنیف ہوئیں ان میں سب سے پہلی میر محمد حسین خاں
تحسین نے اردو کا نام لکھا ہے۔

تحسین کی کتاب "نوطرز مرصع" کی اردو عبارت ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں کہ:-

"اور جو کوئی حوصلہ کھینے اردو علی کا رکھے گا۔
سو مطالعہ اس دستہ نگاہ کا کرے گا تو اس شیوہ
حاصل کرے گا۔"

اس کے بعد پھر اردو کی کہانی شروانی صاحب کی زبانی سنئے رقمطراز ہیں کہ:-

"غزنوی خاندان کے دو آخری بادشاہ خسرو شاہ
وغیرہ ۵۸۳ھ میں لاہور آکر سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے
زیر سایہ ہندو مسلمان مل جل کر رہتے۔ اس لئے نئی
زبان کا وجود میں آنا ناگزیر تھا۔"

اس دوران میں ختلف طریقوں سے پنجاب کا اثر دلی کی زبان پر پڑتا
رہا تھا۔ تغلقوں کے بعد خضر خاں نے جب ۸۱۶ھ میں دہلی پر قبضہ کیا تو
اس کے ساتھ ساٹھ ہزار پنجابی سوار تھے۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں
میں مصدروں کے واضح کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ امر کے آخر میں علامت
مصدر نا اضافہ کر دی جاتی ہے۔ مثلاً رونا۔ گانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ حقیقت
ہے کہ مسلمان فاتحانہ حیثیت سے سب سے پہلے سندھ اور پھر پنجاب آئے اور

وہاں سے ایک زبان لے کر دلّی پہنچے۔ دلّی کا بین الاقوامی ماحول اس نئی زبان کو راس آیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں کثرت سے فارسی اور بھاشا کے الفاظ اس میں داخل ہوئے۔ امیر خسرو کا کلام ہر سہ زبانوں کی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے۔ پنجاب کے صوفیا نے سب سے پہلے اظہار خیال کے لیے اردو کا انتخاب کیا۔ کیونکہ اس نئی بولی کے جاننے اور سمجھنے والے بہ نسبت علاقائی زبان کے زیادہ تھے۔ دلنواز بخش ہجویری رح کے مقبرہ میں ہندو مسلمان نیز مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگ بکثرت تھے جنھوں نے ایک عام فہم زبان میں جو پنجابی اور ملتانی سے مل کر بنی تھی۔ وعظ کہنا شروع کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی رح کے پیر بھائی شیخ عثمان جالندھری کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

عاشق دیوانہ ام پیارے حبیب
از ہمہ بیگانہ ام پیارے حبیب

صفحہ بگڑا ہوا جلوۂ خضر راہ میں رقمطراز ہیں کہ:۔

"اورنگ زیب اس بہو نام شہنشاہ جہاں کے وقت میں
رکھا گیا۔ پتنگر ریختہ گچ کو کہتے ہیں اس لیے اسی مناسبت سے
اس کو ریختہ کہنے لگے"۔

مغلوں کے عہد میں لاہور، دلّی اور لکھنؤ میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لحاظ سے یکساں طور پر کام ہو رہا تھا۔ زبانوں کی تقسیم فرق مراتب کے لحاظ سے

۱۔ بسلسلہ سہیل علیگڑھ۔

از خود ہوگئی تھی۔ محلاتی زبان فارسی اور خانقاہوں کی زبان عربی تھی۔ صوفیا کے طبقہ نے چونکہ وہ عوام سے قریب تر تھا۔ ریختہ کو جو ہنوز عوام کی زبان تھی اپنے اظہار خیال کے لئے انتخاب کیا۔ وہ اس نئی بولی کو "ریختہ، یا "ہندی" کے نام سے پکارتے تھے۔ ۱۲۴۶ھ میں، یک رسالہ "ردّ سماع" پر لکھا گیا اس کے مصنف نے تشریح کی ہے کہ:

"عام لوگ اس کی فہمید سے عاجز تھے اس لئے ریختہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا"

امیر خسرو کا کلام اور بابا گرو نانک کے دوہے۔ قدیم ملی جلی اردو کے حسین شاہکار ہیں۔

ریختہ کو ترقی دینے میں شیخ باجن نے بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ کبیر داس کا عارفانہ کلام اسی زبان میں ہے۔ کئی صدی تک اردو بوریانشین صوفیا اور ان کی حال وقال کی مجلسوں سے آگے نہ بڑھی۔ شخصی دور میں عوامی زبان اور ادب کے پنپنے کا کیا سوال تھا۔ لیکن یہ عجب تماشہ ہے کہ جس تیزی سے مغل سلطنت کا وجود برصغیر کے نقشے سے مٹ رہا تھا اور تخت و تاج کے لینے کے دینے پڑے ہوئے تھے اسی سرعت سے فارسی آمادہ بہ زوال ہو کر اس نئی زبان کے لئے جگہ چھوڑ رہی تھی۔ ہر ایک سیاسی انقلاب زبان و ادب کو سب سے پہلے متاثر کرتا ہے نئے آقا چاہتے ہیں کہ وہ تمام آثار و باقیات مٹ جائیں۔ جن سے "بوئے خون" آتی ہو انگریز کے اس نظریہ نے فارسی جیسی بھاری بھرکم اور شاہوں کے منہ چڑھی زبان کو دفاتر سے ختم کر کے "اردو" کو رائج کیا۔ صدیوں کی تعد مسافت اس نے منٹوں

میں طے کر لی۔ مسلسل ایک سو سال تک اس کا ستارہ اوج پر رہتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ میں سخنورانِ ادب کے زبردست اجتماع کے چمکتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھ کر آسمان کو بھی رشک آتا ہوگا۔ لیکن "ہر کمالے را زوالے"، ۱۸۵۷ء کا دوسرا انقلاب ایسا سخت جان تھا کہ شعرائے اردو تسبیح کے دانوں کی طرح جہاں تہاں بکھر گئے۔ یہ سانحۂ عظیم اردو زبان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ جب اس کے قدر شناس ہی باقی نہیں رہے تو وہ کیوں رہتی۔ قلعہ کے ساتھ اُس کی بھی دکان بڑھا دی گئی تھی۔ ع

جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

دلّی اور لکھنؤ کی لسانی اور ادبی حیثیت کا خاتمہ کوئی معمولی بات نہ تھی جس کو آسانی سے برداشت کر لیا جاتا۔ خانقاہیں اُجڑیں، مدرسے تاراج ہوئے۔ اہلِ علم گولیوں کا نشانہ بنے۔ طوق و سلاسل پہنا کر ان کی پذیرائی کی گئی۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے تاب و طاقت جواب دے گئی۔ وطن کی مٹی سے دیارِ غیر کی بو آتی تھی۔ دل کو تھام تھام کر جو لوگ دلّی کی گلیوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ ان میں محمد حسین آزاد۔ ارشد۔ گورگانی اور حالی بھی تھے۔ ع

دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ان کے ہاتھوں اُردو نے ایک نئی سج دھج کے ساتھ دوبارہ لاہور کی جانب مراجعت کی دل آویزی اور جاذبیت کا یہ عالم کہ اہلِ پنجاب کو پہچاننا مشکل تھا۔ اُنھیں یہ کیا خبر کہ میر و مرزا سے کہیں کیسی جانکاہیوں سے

اس کو سراپا قیامت بنایا ہے اور اس کے لوگ پلک، زبان، ہونٹ کو لے کر کیسی کاوشیں کی ہیں ملاپور سے اردو کا سب سے پہلا اخبار "[illegible]" نکلنا شروع ہو گیا تھا لیکن اردو کے لئے منظم کام کا آغاز آزاد کے لاہور آجانے کے بعد ہوا۔ سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:-

"ان دنوں احباب کی توجہ پنجاب کی طرف ہے جنہوں نے پنجاب میں اردو زبان کی خدمت کی ایکن ان میں آزاد کا نام آب زر سے لکھنے کے لائق ہے"

آزاد کے والد کے ایک شاگرد شیخ رجب علی ارسلطجاہ رئیس جگراؤں "محب الحسن" کے نام سے ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ وہ بیمار ہو گئے۔ عرصہ تک ان کے پاس رہے۔ تاریخ ادبیات اردو کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ قدرت فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا آغاز آزاد کے ہاتھوں سے ہو۔ ۱۸۶۴ء میں انجمن پنجاب قائم ہو چکی تھی اس نے جب اپنا پہلا رسالہ جاری کیا۔ آزاد اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اردو کا نصاب تعلیم مرتب کیا نیز اردو شعر و ادب کی تاریخ پر لیکچروں کا ایک سلسلہ جاری کیا جس پر پورے ملک نے انھیں خراج تحسین ادا کیا۔ ان کے انھیں لیکچروں کے مجموعہ نے "آب حیات" کے قالب میں جنم لیا۔ علی گڈھ تحریک کو اس صوبہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کے لئے زمین تیار کرنے میں ان کے قلم کا اہم حصہ ہے۔ دراصل پنجاب میں اردو ادب کی تاریخ بالکل جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ مقامی اور غیر مقامی اہل قلم کی کوششوں

۱؎ "محزن"

سے لاہور کو وہی مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی جو کبھی لکھنؤ اور دلی کے لئے مخصوص تھی۔ ملک کے ہر ایک گوشہ سے اہل قلم کی کافی تعداد آئی قدر دانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پہ جگہ دی۔ آزاد۔ حالی۔ ارشد گورگانی۔ ممتاز علی تاج۔ آغا حشر۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ناجور نجیب آبادی۔ محمود شیرانی نے اردو ادب کے دور آخر میں بڑا نام پیدا کیا۔ پنجاب میں اردو کی ترقی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ "کوہ نور" کے بعد ایک دوسرا اخبار "پنجابی" ۱۸۶۵ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ ایک تیسرا پرچہ اسی زمانہ میں "خیر خواہ ہند" سیالکوٹ سے جاری ہوا۔ دیوان چند اس کے ایڈیٹر تھے۔ اخبار "پیالہ" ۱۸۷۲ء میں "نجم الاخبار" ۱۸۷۴ء میں نکلنے شروع ہوئے۔ ۱۸۷۶ء میں "شور محشر" کے نام سے ایک رسالہ حکیم محمد شجاع صاحب نے جاری کیا۔ پہلا اخبار "پنجاب" کا پہلا روزنامہ تھا جس نے سیاسی مضامین لکھے اور سب سے پہلے حکومت کے بعض ملکی معاملات پر نکتہ چینی کی۔ اس کے علاوہ "انتخاب لاجواب" "شریف بی بی" اور "بچوں کا اخبار" بھی محبوب عالم صاحب کی نگرانی میں نکلتے رہے۔

فقیر محمد جہلمی کے "آفتاب پنجاب" اور "سراج الاخبار" نے اردو کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پنجاب میں نہ صرف اردو کی توسیع و اشاعت میں "مخزن" اور "ہمایوں" نے نمایاں حصہ لیا بلکہ زبان کو دلی اور لکھنؤ کے معیار پر لانے کی انتھک کوشش کی۔ چنانچہ "مخزن" کا شمار "الناظر" "مبارک" اور "عصر جدید علیگڈھ" کے زمرہ میں ہوتا ہے۔

مولوی محبوب عالم صاحب ایک کامیاب صحافی ہی نہیں تھے۔ بلکہ صحافی گر بھی تھے لاتعداد لوگ ان کے فیض صحبت سے بہرہ یاب ہو کر اہل قلم بنے۔ اور آسمان صحافت کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ انھیں میں محمد دین فوق بھی تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں "پنجۂ فولاد" کے نام سے اپنا ذاتی اخبار نکالا۔ خود لکھتے ہیں کہ وہ میری توقع سے زیادہ مقبول ہوا۔ مرزا داغ نے تعارفیہ لکھا۔

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری
خریدارو نیا اخبار دیکھو

سنہ ۱۹۰۲ء میں فوق بندھیل کھنڈ کی ایک ریاست نیز بعض دوسری ریاستوں کے دورہ کے سلسلہ میں کسی راجا کے یہاں ایک تقریب میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گئے۔ وہاں کی رعایا کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر فکر و نظر کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کی برادری کے دوسرے لوگ سیم و زر سے جیبیں بھر کر لائے۔ اور یہ غموں کا بوجھ دل پر لئے واپس ہوئے۔ چمن میں جا کر کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھر لیتا ہے۔ اور کوئی اپنے ہاتھوں کو لہولہان۔ سچ ہے بصیرت کے ساتھ زندہ رہنا ہر ایک دور میں محال رہا ہے۔ ع

ہر ایک یگانہ ایک جگہ اضطراب میں

بیسویں صدی کے ربع اوّل کے وہ پہلے ایڈیٹر اور اہلِ قلم تھے۔ جنھوں نے ریاستوں کے مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ بالخصوص ریاست کشمیر کے معاملات پر سیر حاصل مضامین ہوتے تھے۔ فوق صاحب

نے اپنی زندگی ایک صحافی کی حیثیت سے شروع کی لیکن اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مولانا گرامی اور اکبر شاہ خاں نجیب آبادی بھی پنجاب کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں جس قدر حصہ لے سکے وہ اُردو کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

شمس العلماء ممتاز علی نے "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ یہ سب سے پہلا خواتین کا زنانہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ حافظ شیرانی نے لاہور میں بیٹھ کر اُردو زبان و ادب کے لئے جو انتھک کوشش کیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے تحقیق و تدقیق کا جو معیار قائم کیا۔ اس کے بغیر وہ حسن اور نکھار ہی پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ایک زندہ زبان کا خاصہ ہیں۔ وسعت مطالعہ اور نظر میں گہرائی اس درجہ تھی کہ ہر علمی مسئلہ میں ان کی رائے فیصلہ کن سمجھی جاتی۔ ان سے اختلاف کرنے کی جرأت بڑا ہی صبر آزما کام ہوتا تھا۔ ان کا خاص موضوع تاریخ تھا۔ کوئی معرکہ کی تصنیف بازار میں آئی علمی حلقوں میں مصنف کی خوب مدح سرائی کی جا رہی ہے۔ نو وارد کا دل بڑھانا ہر ایک پڑھے لکھے شخص کا قومی فریضہ ہے۔ کیونکہ اچھے لکھنے والوں کا قحط الرجال ہے۔ دلی اور لکھنؤ کا رنگ دوسرا تھا۔ اور پنجاب کا کچھ اور۔ وہاں شروع ہی سے زبان کو اہل قلم کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اس کی ترقی کے ساتھ اس کی حسن و بلاغت پر پوری نظر رکھتے تھے۔ دکن میں اردو کی فرہنگ چھپی، کسی نے مرزا داغ کے سامنے اس کی تعریف کی، اُنھوں نے طنز کیا کہ بھائی جس نے لکھی ہے وہ "عرب نژاد" ہے پنجاب میں پروفیسر شیرانی پہلے ادبی نقاد ہیں۔ آغا حشر کاشمیری نے ڈرامہ کے ذریعہ اُردو کو وسعت دینے میں اہم پارٹ

ادا کیا۔ دنیا کی ہر ایک زبان میں ڈرامہ نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔
پنجاب میں اہل علم کی زیادہ توجہ صحافت کی جانب مبذول رہی بکثرت اخبارات
اور رسائل شائع ہوئے جنھوں نے اردو کو دور افتادہ مقامات تک پہنچا دیا۔
لیکن جہاں تک فکری اور تخلیقی ادب کا تعلق ہے یہ بات "آب حیات" سے
آگے نہ بڑھی۔ صحافتی ادب وقتی اور ہنگامی حالات کے تحت لکھا جاتا ہے۔
اس میں اور علمی و تحقیقی ادب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ علامہ اقبال کا
کام مستثنیات سے ہے جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

Taj Tahir Foundation

باب ہفتم

علی گڑھ تحریک

۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام اس امر کی دلیل تھی کہ ہندو اکثریت نے اپنے لئے ایسا محاذ بنا لیا ہے۔ جہاں سے وہ ملکی حقوق کے حصول کے لئے اپنی طرز فکر پر سے جد و جہد کرے گی۔ لیکن اب تک ہندوستانیوں کو جو تھوڑی سی تعلیمی نیز دیگر مراعات وقتاً فوقتاً ملتی رہی تھیں۔ اُن کی تقسیم میں ہندوؤں نے جس تنگ نظری کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے سرسید اور اُن کے رفقائے کار کو اندازہ ہو گیا کہ "متحدہ قومی نظریہ" کے لئے جہاں تک بنیادی مسائل کا تعلق ہے یکسانیت خیال کی اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں کانگریس کے

طرز عمل پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے سرسیّد نے لکھا کہ:-

"ہندو اور بنگالی دوست الٹی چال چلنا چاہتے ہیں جس میں ہمارا نقصان ہے اور ہماری قوم کے لئے ذلّت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی قوم کو ان حملوں سے بچائیں بے شک وہ ذلّت کے گڑھے میں گری پڑی ہے۔ لیکن اگر وہ چاہیں کہ اس از پا افتادہ کو جوتیوں میں مسل ڈالیں تو اس کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔"

دراصل جس قسم کے سخت مسائل مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ اب قلمی کاوشوں نیز دوسری قومی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے محض جوابی حملوں سے اس زہر ہلاہل کا زور اُس وقت تک نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ جب تک کہ مسلمانوں کے پاس بھی ایک اپنا پلیٹ فارم نہ ہو جہاں سے وہ اپنی تعلیمی۔ سیاسی اور قومی ترقی کے لئے آواز بلند کریں۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء میں اینگلو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس علی گڈھ میں منعقد ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد ادب اور لٹریچر کے ذریعہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پھیلانا تھا۔ کانفرنس کا حسب ذیل لائحہ عمل بنایا گیا۔

(۱) مسلمانوں نے جو قدیم علوم میں ترقی کی تھی۔ اس کی تحقیقات کرنا اور پھر اردو یا انگریزی میں رسالہ جات تحریر کرانا۔

(۲) نامی علماء اور مشہور مصنفین کی سوانح عمریاں اُردو یا انگریزی میں مرتب کرنا نیز جو جو تصانیف نایاب ہیں اُن کو پھر چھپانے کی تدابیر کرنا۔

۱۹۰۳ء میں کانفرنس نے دہلی کے اجلاس میں ایک مزید شعبہ کا اضافہ "انجمن ترقی اردو" کے نام سے کیا جس کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے۔ لاریب پورے برصغیر میں اس وقت ان کی ذات گرامی اپنے تبحر علمی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ مولانا کی خداداد صلاحیت کی بدولت کانفرنس کے اس شعبہ نے اردو ادب اور لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا اور مسلمانوں میں قومی و سیاسی بیداری پھیلانے میں ان کے قلم جوہر رقم نے فعالی پارٹ ادا کیا۔ اس عہد کے وہ پہلے سیاسی ادیب اور قومی شاعر تھے۔ حادثہ کانپور پر ان کی نظم کے چند اشعار نمونتاً ملاحظہ ہوں ؎

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ سنت سیدِ سجاد عالی کی امانت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں انھیں او جلد سو جانے کی عادت ہے

ان کی ادارت میں اخبار "مسلم گزٹ" نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں بیش قیمت خدمات انجام دیں۔ "علی گڈھ منتھلی" کی جانب سے اردو ادب کی ترقی کے لئے جو کمیٹی بنی تھی اس میں مولانائے مرحوم بھی شامل تھے۔ اچھے مضمون پر دس روپئے نذر کئے جاتے تھے۔ شبلی کو اپنے دور کے دوسرے اہل قلم کے مقابلہ میں جو امتیاز خصوصی حاصل ہوا وہ ان کا اچھوتا اور منفرد طرز نگارش تھا۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے پوری عبارت انشائے لطیف کا حسین نمونہ ہوتی تھی۔ مہدی افادی مرحوم نے "الندوہ" کی تحریر سے متاثر ہو کر لکھا کہ:۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردو سے خاصہ
کی داد ملتی"[1]

یہ وقت ان کے ذہنی اور شعوری ارتقا کے انتہائی عروج کا تھا۔ لیکن اُسی تناسب سے طبیعت میں سیمابی صفت بڑھتی جاتی تھی۔ علی گڑھ اور اعظم گڈھ کو اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لئے ناکافی سمجھ کر حیدر آباد کا رُخ کیا۔ ہندوستان کے بہترین دماغ رکھنے والے اہل قلم کا اجتماع اس وقت وہاں ہو گیا تھا۔ جاتے ہی "دار الترجمہ" قائم کرنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے اور اس کے لئے حسب ذیل اشتہار جاری کیا۔

"انجمن ترقی اُردو حیدر آباد نے حسب ذیل کتابیں ترجمہ کے لئے انتخاب کی ہیں۔ جو صاحب کسی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیں اس کے پہلے دس صفحہ کا ترجمہ کر کے سکریٹری کے پاس بھیج دیں مترجمین کو خاصہ معاوضہ دیا جائے گا۔"

قومی اور ادبی خدمت کرنے کی جو لگن انھیں کشاں کشاں وطن سے اس قدر دور لے گئی تھی حیدر آباد کی سنگلاخ زمین اس کے لئے قطعی غیر موزوں ثابت ہوئی۔ صدرنگ سودے دماغ میں لے کر گئے اور بے نیلِ مرام واپس ہوئے۔ درباری غمزوں کی کشاکش میں پڑنا اُن کے بس کی بات نہ تھی چند گنے چنے زاویے ان کی وسعتِ نظر کا بار کیسے اُٹھاتے۔ وطن واپس آکر پھر اُسی عالمانہ استغنا کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں منہمک ہو گئے۔ اقلیم ادب کی بادشاہت ان کی آمد کی نہ جانے کب سے منتظر تھی۔

---

[1] افادات مہدی ص۵۷

مہدی افادی مرحوم نے لکھا:۔

"افسوس ہے کہ سلسلۂ آصفیہ شبلی کی جامعیت سے پورا فائدہ نہ اُٹھا سکا، نہ اُن کی مخفی قوتوں کو تحریک دی گئی۔ لیکن ہم خوش ہیں کہ اب "الندوہ" گذشتہ نقصان کی تلافی کر دے گا"[1]

کانفرنس میں منسلک لوگوں میں خواجہ غلام الثقلین سب سے زیادہ سرگرم کارکن اور اہلِ قلم میں سے تھے۔ شعبۂ اصلاحِ تمدن کے سکریٹری کی حیثیت سے اُنھوں نے کافی تحریری کام کیا۔ مولوی انوار احمد زبیری مرحوم لکھتے ہیں کہ:۔

"اس شعبہ نے نہایت مفید نتیجہ خیز لٹریچر قوم میں پھیلا کر خصوصیت کے ساتھ اس کو ادب کے موضوع پر متوجہ کیا۔ اُنھوں نے بڑے پر اثر خطبے اور تقریریں مبحث مذکور پر کانفرنس کے جلسوں میں کیں"[2]

"عصرِ جدید" کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء کیا جس کا شمار اس وقت کے بہترین سیاسی پرچوں میں تھا۔ علی گڈھ منتھلی میں سید سجاد حیدر یلدرم نے اس کا "مخزن" سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"عصرِ جدید کہتا ہے کہ زندگی دل آویزیوں میں صرف ہو جانے کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمہ صیغہ سوشل

---

[1] افاداتِ مہدی ص۷۷ [2] مرقع کانفرنس

ریفارم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بننے کے لئے وہ "مخزن" کو سنجیدہ اور فلسفی بننے کی دعوت مبارزت دیتا ہے"۔

یلدرم نے اپنے استاد کے نقش قدم پر چل کر ایک نئے اسلوب نگارش کی اساس ڈالی تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کر دجلہ اور فرات کے سنگم کے سینہ پر چل رہا ہے۔ عرض نہیں کر سکتا کہ اس نام نے میرے دل پر کیا اثر کیا۔ آہ اب ہم ان دریاؤں پر ہیں۔ جو اسلامی افسانہ، اسلامی ادب اسلامی شاعری کے ہر ایک صفحہ پر موجزن ہیں"۔

سرزمین وطن چھوڑ کر جب جہاز بصرہ پہنچا۔ یلدرم حسب دستور قسطنطنیہ کے لئے لے جائے گئے اس واقعہ کی مرقع کشی کرتے ہوئے شعر کہا۔ ؎

زنداں کو چلے مچل مچل کر

ان کے مضامین کا مجموعہ "خیالستان" ادب لطیف کا بہترین نمونہ ہے الفاظ کی نگری کے وہ بادشاہ ہیں۔ ان کے سحر کار قلم سے لکھے ہوئے لاتعداد صفحات پڑھ ڈالئے پھر بھی سیری نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ کاش یہ سلسلہ کسی کی زلفِ دوتا کی طرح اور دراز ہوتا۔ ؎

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

علی گڈھ نے جو ذہین اور طباع لوگ پیدا کئے ان میں عزیز مرزا بھی تھے۔ بدقسمتی سے انھیں اپنی قومی سرگرمیوں کے لئے ایک ریاست کا دہانِ تنگ ملا۔ ذہانت و

فطانت کا سارا اندوختہ وہاں کے سازشی ماحول کو نذر کر کے واپس ہوئے۔
اس چیز کا شدید ردِّ عمل یہ ہوا کہ وہ اس وقت کی سب سے زیادہ سرگرم سیاسی جماعت "مسلم لیگ" میں شامل ہو گئے اور اس کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کے لئے انھوں نے ملک کے طول و عرض میں طوفانی دورے کئے۔ لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ قضا و قدر کے دربار سے ان کی طلبی کا پروانہ آپہنچا۔

سر سید کے لٹریری سکریٹری مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا شمار ان چند صاحبِ طرز ادیبوں میں ہوتا ہے جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان کی نثر نازک تشبیہات اور استعارات سے مملو ہوتی ہے اور عبارت میں شعر کا گمان ہوتا ہے۔ ارسطو لکھتا ہے کہ :-

"شاعری کی جوہری نوعیت نثر میں بھی ہو سکتی ہے"۔

اس لحاظ سے مولانا کے رشحاتِ قلم ان تمام خصوصیات کے بدرجۂ اتم حامل ہیں۔ "معارف" علی گڑھ جس نے مولانا سلیم کو ادبی دنیا میں روشناس کرایا۔ بہت مختصر عمر پائی لیکن اس کے باوجود اس دور کے مؤقر پرچوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے بعد "مسلم گزٹ" لکھنؤ نے ان کے قلم کی پرکاری کا سکّہ ہر ایک دل پر بٹھا دیا۔ حیدر آباد میں اردو زبان اور ادب کے لئے جو کام ہوا راس مسعود اور سر اکبر حیدری کے بعد مولانا کا اس میں اہم حصّہ ہے۔ "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" اُن کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس نے ان کے نام کو تاریخ ادبیات میں امر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ ان کے متعلق لکھتے

ہیں کہ :-

"سلیم پانی پتی ایک شاعرانہ طبیعت رکھنے والے انشاء پرداز تھے۔ ان کی نگاہوں میں کسی چیز کا علمی پہلو ہی نہیں آتا تھا۔ بلکہ اس کی شعری کیفیتیں بھی ان کے سامنے خود کو بے حجاب کر دیتی تھیں اس حیثیت سے وہ اردو کے اسکر وائلڈ ہیں۔"

یہ سارا نظام کائنات فطرت کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت گردش پیہم میں مصروف ہے سلسلہ روز و شب کی نیرنگیاں کبھی ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ سورج جب اپنی حرارت بخش کرنوں سے کرۂ ارض میں زندگی کی روح پھونک کر رخصت ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ چاند لے لیتا ہے، جس کی ضیا پاشیاں کائنات کے حسن کو دو بالا کر دیتی ہیں لیکن انسان جس کی تقریب میں یہ سارا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ ثبات و قرار سے اس کی ازلی محرومی بڑا المیہ ہے۔ لاتعداد خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ موت سارے عزائم پر آنِ واحد میں خطِ تنسیخ کھینچ دیتی ہے۔ ایک ادیب یا اہلِ قلم کی موت سے اس مشن اور مقصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ جس کا کہ وہ تازیست مناد رہتا ہے۔ مہدی افادی کا شمار بھی ایسے ہی صاحبانِ کمال میں ہے۔ نقدِ ادب پر حالی کے بعد ان کی رائے کو بنیادی اہم سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر کلاسیکی نقطہ نظر سے بحث کر کے ثابت کیا کہ تاثر، تنقید اور ہجو میں کیا فرق ہے بعض مشہور شخصیتوں کی کتابوں پر جو بے لاگ تبصرے کئے ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی فائدانہ عظمت ان کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں کچھ اس طرح سے جاگزیں ہو گئی تھی کہ مودت و دوستی کا کوئی سابقہ بھی حائل نہیں ہوتا تھا۔ دراصل یہی چیز تنقید کی روح کہلاتی ہے۔ اردو

ادب کو اُنھوں نے جو کچھ دیا وہ حجم کے اعتبار سے بہت کم ہے لیکن جس قدر لکھا اس کو صنف ادب میں قیمتی اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔ ندرت خیال، الفاظ پر غیر معمولی دسترس، لطیف پیرایہ میں ہلکی ہلکی چوٹیں کر کے خود بھی محظوظ ہوتے اور قارئین کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ کانفرنس کے چند اجلاسوں میں اس وقت کی چند مشہور شخصیتوں کو معرض بحث میں لا کر جیسی جیسی گل افشانیاں کی ہیں اُن کو پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ وہ بجز صنف ادب کی اس شق کے اور کسی موضوع پر قلم نہ اُٹھاتے۔ ملک کے علمی حلقوں میں عرصہ تک اس جواں مرگ ادیب کا ماتم ہوتا رہا۔ لیکن سب بے سود راہی اپنا سفر ختم کر چکا تھا۔ وائے قسمت۔ ؏

میرتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

علی گڈھ تحریک کے باب میں سرسید کی علمی و ادبی خدمات کے علاوہ جن پر بہت کچھ لکھا اور شائع کیا جا چکا ہے۔ ان کے نورتن میں سے نواب محسن الملک۔ وقار الملک۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی اور نواب عماد الملک نے بھی مسلمانان ہند کے سب سے بڑے تعلیمی و ثقافتی مرکز علی گڈھ کی ترقی پسند علمی و تحقیقی روایات کو بہت کچھ آگے بڑھایا۔ خصوصیت سے اسی گروہ کے ایک اور بزرگ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تو علی گڈھ کی خدمات علمی و ادبی کو ایسا وقار بخشا کہ اس کو اعظم گڈھ ثانی بنا دیا اور علامہ شبلی کے علیگڈھ چھوڑ دینے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو بدرجہ اتم پورا کر دیا۔

صف اوّل کے اساتین ادب کے گذر جانے کے بعد کم و بیش پچاس سال تک حضرت مولانا شروانی افق علی گڈھ پر آفتاب کی طرح چمکتے رہے اور ان کی ذات گرامی نیز

ان کا نادر الوجود کتاب خانہ جیب گنج ملک کے طول و عرض کے عالموں اور ادیبوں کا مرکز ثقل بنا رہا۔ نواب صاحب ایسے سنجیدہ مذاق رکھنے والے تھے کہ ان کے نتائج فکر کی گراں مایگی کو علامہ شبلی اور ان کے جانشین علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی تسلیم کیا اور عہد جدید کے بے مثل ادیب مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس کی عظمت کا اقرار کیا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے اور ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایجاز اور حق گوئی کا بہترین نمونہ ہوتی تھی۔ جو کچھ لکھتے تھے اس کے لئے بیحد مطالعہ اور بے پناہ کاوش کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کی لکھی ہوئی کوئی چیز کبھی تنازعی یا کسی اعتبار سے قابل اعتراض نہ ہوئی۔ بکثرت تحقیقی مضامین اور مقالات کے علاوہ جن کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نواب صاحب دس بارہ دوسری معیاری کتابوں کے بھی مصنف تھے اور ان کی تصانیف کو ہمیشہ اہل علم نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔

علی گڈھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ان کے ساتھیوں اور شاگردوں نے بھی جدید ادب کو فروغ دینے میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ یہ جماعت تنقید ادب برائے ادب کے میدان میں عرصہ تک کام کرتی رہی اور ان کی شگفتہ نگاری نے علی گڈھ کا نام بہت کچھ اونچا کیا۔

آخر میں سید الطاف علی بریلوی نے اپنی قائم کردہ مجلس مصنفین علی گڈھ اور سہ ماہی رسالہ مصنف کی بساط علمی بچھائی اور ایک طرح سے اس کام کا احیاء اور تجدید کی جو سرسید اور ان کے ساتھیوں کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا تھا صرف نواب صدر یار جنگ بہادر اس صالح مکتبۂ خیال کی واحد یادگار باقی رہ گئے تھے اور ان ہی کی سرپرستی میں بریلوی

صاحب نے اپنے لئے اور اپنے کام کے لئے علمی دنیا میں ایک مقام پیدا کیا۔
تقسیم ملک کے بعد سے علی گڈھ کا شیرازۂ علمی بکھر چکا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں نواب صدر یار جنگ اللہ کو پیارے ہو گئے اور سید الطاف علی بریلوی بھی ترک وطن کر کے پاکستان آ گئے۔ علی گڈھ میں فی الوقت پروفیسر رشید احمد صدیقی بفضلہ بقید حیات ہیں لیکن سیاسی انقلاب اور مسن ہو جانے کے باعث وہ اس رعنائی خیال و بیان سے محروم ہو چکے ہیں جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ بکثرت نئے لکھنے والے بھی علی گڈھ میں محفوظ و موجود ہیں جن کا پایۂ علمی اگرچہ مسلم ہے لیکن سیاسی اعتبار سے مجبور و لاچار اور بیکس ہونے کی وجہ سے اُن کے کام قطعاً بے روح ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی البتہ روایات کہن کو دامن بچا بچا کر تازہ رکھے ہوئے ہیں اللہ انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

Taj Tahir Foundation

باب ہشتم

ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد انیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر کے ان نامور اہل قلم میں سے ہیں، جو بادل کی طرح فضا پر چھا جاتے ہیں۔ اور پھر گھن گرج سے برستے ہیں۔ ان کی تحریروں میں فنکارانہ چابکدستی سے زیادہ ریفارمر اور مجدد جیسا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ ہر ایک ادیب کے قلمی کارناموں کو جانچنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تخلیقات کس قسم کے حالات میں پیش کیں۔ اور اپنے دور کی عکاسی کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا۔

شمس العلما مولوی نذیر احمد کی ادبی زندگی کا آغاز اس زمانہ میں ہوا جب مسجع اور متفنی زبان لکھنا انشا پرداز ہونے کی سب سے بڑی سند سمجھا جاتا تھا۔ اور سارے نثری اور شعری ادب کا انحصار تشبیہات اور استعارات پر موقوف تھا۔ کسی بھی موضوع، زیر بحث پر صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے جاتے مگر التزام یہ کیا جاتا کہ قاری کو اس طرح سے الجھاؤ اور پھیلاؤ میں مبتلا کر دو کہ اسے یہ سوچنے

کی مہلت ہی نہ ملے کہ زلیخا عورت تھی یا مرد، مبتدا اور خبر کو تہہ بہ تہہ لپیٹ کر رکھنے کا فن معراج پر تھا۔ اُردو میں سادہ اور آسان زبان لکھنے کی ابتدا سب سے پہلے غالب نے اپنے خطوط میں کی سرسیّد اور ڈپٹی نذیر احمد ان کا اتباع کرنے والوں میں سرِ فہرست ہیں۔ اُنھوں نے ادب کو اس روائتی ڈگر سے ہٹا کر نئی راہوں پر ڈالا۔ ڈپٹی نذیر احمد مباحث پر لکھیں یا تعلیم اور اصلاح معاشرت پر، سب کے محوری نقطے انسان ہوتے ہیں۔ فرشتے نہیں۔ انسانی زندگی کا مطالعہ مہد سے لے کر لحد تک جس گہری نظر سے وہ کرتے ہیں اُس عہد کا کوئی دوسرا ادیب اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں اور اُنھوں نے ادب کی اس صنف کو اصلاح حال کے لئے مختص کیا۔ ان کے ناولوں میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں زبان و بیان میں ادبیت برائے نام یا نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ موضوع میں کوئی ندرت پلاٹ میں کسی قسم کا اچھوتا پن نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کردار غیر معمولی طور پر جاندار ہوتے ہیں۔ وہ اچھے کام کریں یا بُرے سیمابی کیفیت ہر آن ان پر طاری رہتی ہے۔ ماما عظمت کا کردار اُن تمام شیطانی قوتوں کا حامل ہے جو ذہانت کے غلط استعمال سے کسی انسان میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اکبری خانم کا طفلانہ طرزِ عمل اکثر قاری کو کھلنے لگتا ہے۔ وہ اس کی خاندانی شرافت و نجابت کو اس سطح پر دیکھنا پسند نہیں کرتا جہاں اس نے اپنے کو پہنچا لیا ہے۔ پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کہ کاش اکبری کے پاس بھی اپنی چھوٹی بہن کے حصّے میں سے عقل کا بہت نہیں تو تھوڑا سا ہی حصّہ آجاتا۔ لیکن آفریں ہے ڈپٹی نذیر احمد کی ہمت بلند پر۔ آگے سوچتے ہیں نہ پیچھے

اپنے کامیاب اور ناکام دونوں قسم کے کرداروں کو ان کی آخری منزل پر پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں بعض وقت یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ان کی کہانی کا کوئی ہیرو اب وجودی طور پر ختم ہوا چاہتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر صفحۂ قرطاس پر کچھ ایسی شان سے نمودار ہو جاتا ہے کہ حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اس مرحلہ پر کہانی کے خالق کا فن اس بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں بڑے بڑے اہل قلم کے پر جلتے ہیں اور اس منزل سے دامن آٹھا کر اور نظریں جھپکا کر نکل جانے میں اپنی عافیت ڈھونڈھتے ہیں۔ تماشہ خانم عرف دو بارنا ول کے پردۂ سیمین پر آتی ہے ایسے بھرپور رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہ اس کی شخصیت میں قاری بیدریغ دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اکثر گھر کی عورتوں کو کہتے سنا ہے کہ بوا خالہ ہو تو ایسی ہمدرد کہ اس پر ماں بھی قربان ہے۔ اصغری کی خوبیاں ہر آئینہ مسلّم ہیں، اس پر حرف گیر ہونے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔ نصوح جیسے "بلاوجہ محبت" کرنے والے اور دوسروں کے نجی معاملات میں خواہ مخواہ دلچسپی لینے والے لوگ آج ہمارے معاشرے سے اُٹھ چکے ہیں۔ اور اُن جیسے لوگوں کا وجود ہمارے یہاں "عنقا" کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ ہمسایوں اور محلہ کے بچوں سے پدرانہ محبت بزرگوں کا احترام، نوجوانوں پر کڑی نظر رکھنا بزرگی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اُنھوں نے ادبی افکار و آراء کو خواص اور امراء کی دسترس سے نکال کر عوام کے لئے مخصوص کیا۔ بڑی بی اور ان کے چاروں نواسے، تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کہانی کا مرکزی کردار بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ "ابن الوقت" اور "رویائے صادقہ" میں اُنھوں نے ایک خطیب کا سا

واعظانہ انداز۔ ریفارمر کی زبان اور لہجہ اختیار کیا ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل جن کو ان کے ہمعصر پرکاہ کی برابر وقعت نہیں دیتے۔ ان کے یہاں خاص اہمیت رکھتے ہیں اُنھوں نے واقعہ نگاری کا اپنی تحریروں میں جو نمونہ پیش کیا ہے درحقیقت وہی ہر ایک ادب پارہ کی روح ہوتا ہے۔ اسی راہِ پُرخار میں ان ہی ادیبوں نے قدم رکھنے کا حوصلہ کیا ہے۔ جن کو عوامی نفسیات پر پورا عبور ہوتا ہے۔ جو اپنی فراست سے حالات کی گرہیں کھولنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ جو بے رنگ و روغن تصویروں کو اپنے قلم سے اس قدر دیدہ زیب بنا دیتے ہیں کہ نگار خانہ میں انھیں سب سے اونچی جگہ نصب کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی صاحب کی زود نویسی پر اکثر لوگوں کی طرف سے یہ سوال اُٹھا کہ اُن کا اسلوبِ بیان کیا ہے؟۔ طرزِ نگارش میں ادبیت کی چاشنی کتنی اور کس قدر ہے؟ تاریخ کی اس نئی کروٹ پر جب کہ مسلمان سرسید کی رہنمائی میں سیاسی اور تعلیمی انحطاط کو دور کرنے میں مصروف تھے انھیں گھریلو معاملات کے گورکھ دھندے میں اپنی قلمی کاوشوں کو پھنسانے کی کیا ضرورت تھی بالخصوص جبکہ وہ سرسیّد کے ساتھ قدم سے قدم ملائے ہر ایک قومی اور تعلیمی معاملہ میں برابر کے شریک و سہیم تھے۔ سب جانتے ہیں کہ معاشرتی انحطاط ہی آگے چل کر سیاسی اور دوسری خرابیاں لاتا ہے۔ اس وقت یہ بنیادی مسئلہ تھا کہ "گھر" جو آئندہ نسلوں کو تیار کرتے ہیں، ان کی اصلاح ہونا از بس ضروری ہے "لوکس" کہتا ہے کہ

"میں کبھی اپنے اسلوب نگارش کے لئے معمولی درجہ کی

زحمت گوارا نہیں کرتا۔ نہ یہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرا
کوئی منفرد اسلوب بھی ہے۔ کیونکہ میں نہایت سادہ، آسان
الفاظ میں بات کہنے پر یقین رکھتا ہوں"۔

بعینہٖ یہی بات ڈپٹی صاحب کی تحریروں پر صادق آتی ہے۔ مجدد اور ریفارمر کی زبان ردیف و قافیہ کی پابندیوں سے ہمیشہ آزاد رہی ہے۔ فکری اور مقصدی ادب ایک مثبت نصب العین کے تحت وجود میں آتا ہے نہ کہ لذتِ چشم و گوش کے لئے۔ ان کے قلم کی یہی سادگی اور پرکاری تو ہے کہ جس سے ان کی زبان و بیان میں حسن اور نکھار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک منفرد مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ :-

"یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں حیدرآباد کے سرسالار جنگ کو نذیر احمد کا شیدائی بنا دیا تھا کہ وہ ڈپٹی ہیں قابوں کا دور چل رہا ہے وقتاً سرکاری ڈاک آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو پیش کی جائے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں امیر الامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے۔ چہرے پر وہ کیفیت پیدا ہو رہی ہے جسے زیرِ لب تبسم کی ہلکی لہریں کہئے"۔

ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تقریباً ایک صدی گذر جانے کے باوجود ہمارے گھروں میں اب بھی وہی زبان بولی جاتی ہے اور اس عہد کی تمدنی اور ثقافتی اقدار میں بہت کم ردّ و بدل ہوا ہے۔

باب نہم

مولانا حالی

حالی کا شمار ان بصیرت یافتہ شخصیتوں میں ہوتا ہے جو سب سے پہلے سرسید کی تحریک میں شامل ہو کر ان کی دست راست بنیں سرسید دنیا کے چند گنے چنے مصلحین میں سے تھے جن کے گرد حالی۔ شبلی۔ نذیر احمد۔ چراغ علی۔ محسن الملک جیسے زبردست شاہیرِ وقت کا اجتماع تھا۔

ان سب نے سرسید کے مثبت نصب العین کے لئے ان تھک کام کئے۔ وہ جس تجویز و تحریک کو لے کر اُٹھے یہ سب منّاد کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں اس کی ترویج و اشاعت کا کام کرتے تھے۔

پہلے مروجہ زبان فارسی اور پھر اُردو میں خمریات اور جنسیات پر ہمارے شعراء نے جس قدر طبع آزمائیاں کی تھیں اور ایسے مضامین میں جس قدر باریکیاں نکالی تھیں شاید ہی کسی دوسرے موضوع پر کی ہوں۔

ع۔ خرد کا نام نہ لو اور جنوں کی بات کرو

شاعری کی سند قرار پایا تھا۔ اس دور کے شعراء دامن نچوڑی ہوئی شراب سے

فرشتوں کو وضو کراتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:۔

ع دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

جدھر جاتے ہیں جام و سبو ساتھ ہیں۔ ہر جگہ میخانہ بنانے پر آمادہ و تیار ہیں زندگی پیمانوں کے گرد رقص کناں رہتی ہے۔

ع رات ہو ساقی ہو مے ہو جام ہو

جب دلّی اور لکھنؤ اجڑ گئے تو شاعروں نے مختلف ریاستوں میں پناہ ڈھونڈلی۔ تھوڑی سی عافیت نے آسودہ خاطر ہونے کا اس قدر سامان کر دیا کہ بساط شاعری بچھا کر بیٹھ گئے۔ ظہیر دہلوی حیدر آباد گئے۔ وہاں نہ پہنچتے اور دربار سے وابستہ نہ ہوتے تو نان جویں کا سامان کیسے ہوتا۔ کیسے درد سے کہتے ہیں کہ:۔

شہر میں دھوم ہے کل سے کہ ظہیر خستہ
سرگذشتِ دلِ محزوں ہیں سنانے والے

داغ جیسا صاحبِ کمال دار و غۂ اصطبل بنایا جائے۔ ہائے ناقدر شناسیٔ زمانہ اس پر بھی علاقائی عصبیت نے پیچھا نہ چھوڑا مقامی شاعروں میں سے کسی نے ان کی ہجو میں کہا ہے

آیا دلّی سے ایک مشکی خر — آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

دنیائے شعر و شاعری کے اس زوال پذیر پس منظر میں حالی کی قومی شاعری منصّۂ شہود پر ابھری۔ ان کی پُر درد آواز نے نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اردو کے یہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کو دیوانِ خاص سے نکال کر دیوانِ عام میں لاکر کھڑا کر دیا۔

۱۸۸۲ء کا زمانہ ہے نواب ضیاء الدین خاں کے مکان پر مشاعرہ منعقد ہوا۔ حالی نے بھی اپنی غزل پڑھی جو درج ذیل ہے۔

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانہ مطرب — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

پنجاب میں نظم نگاری کا سنگ بُنیاد حالی اور آزاد نے رکھا۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ شاعری میں نقطۂ خیال کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے کیونکہ عملی ترغیب کے لئے نثر سے زیادہ نظم زود اثر ہوتی ہے۔ شاعر قوم کو موت کا بھی پیغام دے سکتے ہیں اور زندگی کا بھی۔ عبرانی شاعری کے متعلق ایک یورپین ادیب لکھتا ہے کہ

"عبرانی شاعروں کے کلام میں اس قدر جوش ہے کہ ان کے شعر سُن کر یہ معلوم ہوتا ہے گویا صحرا میں ایک تناور درخت جل رہا ہے یا کسی پیغمبر پر وحی نازل ہو رہی ہے۔"

ملٹن کہتا ہے کہ[1]

"شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔"

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۷

یہ ساری خوبیاں حالی کی شاعری میں بدرجہ اُتم پائی جاتی ہیں۔ چُپ کی داد، بیوہ کی مناجات، مثنوی حُبِ وطن، ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان سے قبل اُردو کے تمام شاعروں نے معشوق اور گل و بلبل کے علاوہ دوسری زمین میں بھی مضمون باندھے ہیں مثلاً غالب سامعین کو بتاتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا نہیں اور اب اس کا وقت آخر ہوا چاہتا ہے۔ آنکھوں میں دم ہے۔ لیکن مینا و ساغر دکھلایا جائے تو شاید دوبارہ زندگی ہو جائے۔

پری۔ چہرہ لوگوں کی کج ادائیاں دل و جگر کا خون کئے دیتی ہیں۔ لیکن اپنے دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے اسی ہرجائی کے پاؤں پڑتے ہیں۔ عالم خود فراموشی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ نہ اپنی حالت پر نظر ہے نہ گرد و پیش کی خبر۔ راوی کی اس اطلاع پر یقین ہی نہیں کرتے کہ ان کے گھر کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ۔ ؏

گری تھی جس پہ کل، بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

زخم پر زخم لگا کر سینہ و جگر چھلنی کئے دیتے ہیں۔ لیکن ان کے مندمل کرنے کے لئے کوئی سامر ہم تجویز نہیں کرتے۔

حالی نے اپنی شاعری میں اس عہد کے زوال پذیر معاشرہ کی صحیح اور سچی مرقع کشی کر کے ثابت کیا کہ تم جس جنت ارضی کے خواب دیکھ رہے ہو گردش لیل و نہار کے چکر میں وہ تو کبھی کی تہ و بالا ہو چکی ہے۔ کسی نے بُرا مانا یا بھلا انھیں جو کہنا تھا کہتے رہے۔ ؏

آئینہ ہم نے دکھایا تو بُرا مان گئے

اس کی پرواہ کرتے تو ان کا کلام قومی پیغام کیسے بنتا۔ ان کی شعلہ بیانی۔ نالۂ نیم شبی اور دعائے سحری دونو کیفیات کی حامل ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

حالی سرسید تحریک سے وابستہ نہ بھی ہوتے اور "مسدس" کے سوا اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی دنیا ان کی عظمت کا بحیثیت شاعر کے اعتراف کرتی۔ اُردو شاعری کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اُنھوں نے اس کو اپنے اظہار و خیال کا ذریعہ بنایا۔ ناظر کاکوروی رقمطراز ہیں کہ:۔

"مسلمان نوجوانوں کے دماغ کی تشکیل میں "مسدس" کا بڑا دخل ہے۔ مقبولیت کے جتنے معیار ہو سکتے ہیں ان پر جانچئے تو ان جملہ معیاروں پر پورا اُترے گا"[1]۔

سرسید نے حالی کی شخصیت کا اعتراف اپنی ایک تقریر میں کیا تھا۔ کہتے ہیں۔

"ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے اور فخر کرنا چاہئے کہ ہماری قوم میں ایک شخص ایسا پیدا ہوا کہ آئندہ نسلیں جس کا نام احترام سے لیں گی اور خفتہ قوم کو بیدار کرنے والا اور شاعری میں راہ راست دکھانے والا قرار دیں گی"۔

لیکن نثر میں بھی اُنھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں "یادگار غالب" اور "حیاتِ جاوید" کا شمار

---

[1] حالی کا نظریۂ شعر ص ۸۲

اردو کی معیاری کتب میں ہوتا ہے۔

مسدّس کے دیباچہ میں وہ رقمطراز ہیں کہ :۔

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ معزز ذلیل ہو گئے۔ شریف خاک میں مل گئے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے اخلاق بگڑ چکے ہیں"

اُردو میں نقد ادب پر اُنھوں نے سب سے پہلے قلم اُٹھایا۔ "مقدمہ شعر و شاعری" اُردو میں تنقید پر ان کی معرکتہ الآرا کتاب ہے۔ شاعری کے آداب اور اصول کیا ہیں۔ شعر کی تاثیر اس کی ماہیت کیا ہے۔ مقصدی اور منفی شاعری کس کو کہتے ہیں۔ معاشرہ پر اس کے کیا اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔ غرض کہ اصناف شاعری کی کوئی شق باقی نہیں جس پر اُنھوں نے شرح و بسط کے ساتھ روشنی نہ ڈالی ہو۔ شاعر اور اس کے کلام و بیان کے لئے حالی کے وضع کردہ اصولوں کو اس قدر طویل مدت گذر جانے کے باوجود ترمیم و تنسیخ کرنے کا کسی کو حوصلہ اور ہمّت نہیں ہوئی ہے۔ اُردو زبان میں "مقدمہ شعر و شاعری" کو وہی مقام حاصل ہے۔ جو یونانی زبان میں "شعریات ارسطو" کا ہے۔

طاہر جمیل صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"انگریزی زبان میں ورڈس ورتھ کے مقدمات کا جو مقام ہے وہی حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کا ہے"۔

عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں :۔

"مقدمہ شعر و شاعری شعراء کے لئے مکمّل ضابطہ کی حیثیت

رکھتا ہے"۔

انگریزی میں پروفیسر لیسیل کومبی کی کتاب "نقدِ ادب" طرزِ بیان کے اعتبار سے ان کی اس کتاب کے ہم پلّہ ہے۔

اُردو ادب کے وہ نقّاد اوّل تسلیم کئے گئے ہیں۔ "حیاتِ جاوید" ان کی اعلیٰ ترین نثر کا مکمّل نمونہ ہے۔ سرسیّد کی پھاری بھرکم اور ہمہ گیر شخصیت اس کی مستحق تھی کہ حالی جیسا کامِل الفن عالم ان پر قلم اُٹھائے۔ ان کے حالات رقم کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ سرسید کی ۶۰ سالہ قومی جدوجہد کی مکمل تاریخ ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ مشاہدہ پر مبنی ہے سُنی سنائی روائتوں پر نہیں۔ اس میں حالی کا اچھوتا اور دل کش طرز اسلوب بھرپور طریقہ سے نمایاں ہے۔

Taj Tahir Foundation

باب دہم

علامہ شبلی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی بھی شخصیت کے متعلق صرف ایک بھرپور جملہ کہہ دیا جائے تو وہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کی اس طرح سے عکاسی کر دیتا ہے کہ ہزار توصیفی صفحات بھی نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے علامہ شبلی پر ایک مضمون لکھا اور اس کا یہ جملہ امر ہو گیا۔

"شبلی پہلے یونانی فلسفی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے"

یوں تو ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک مبسوط سوانح عمری مرتب کر کے اپنے فاضل استاد کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا لیکن چونکہ ان کا شمار اپنے زمانہ کے ان عظیم رجال میں سے ہے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ان پر متعدد رسائل میں کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہتا ہے۔

سرسید کی مقناطیسی کشش ملک کے تمام منتخب روزگار لوگوں کو کھینچ کر ان کی تحریک میں شامل کر رہی ہے۔ ۱۸۸۱ء میں شبلی بھی اپنے بھائی سے ملنے علی گڈھ آئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ سرسید کے دست راست بن کر مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ ان کا تقرر مشرقی زبانوں کے معلم کی حیثیت سے علی گڑھ کالج میں ہو گیا۔ ان کا علمی شغف دیکھ کر سرسید نے انھیں اپنے کتب خانۂ خاص سے استفادہ کرنے کی اجازت دے دی۔ پڑھانے سے جو وقت بچتا اس کو کتب بینی میں صرف کرتے تھے۔ کثرت مطالعہ نے ذہانت و فطانت کے اس جذبہ کو ابھارنے میں معاونت کی جو قدرت نے ان کو ودیعت کیا تھا۔ صرف چار سال کے قلیل عرصہ میں وہ مہ کامل بن کر ایم اے او کالج (علی گڑھ) کے افق پر نمودار ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم "صبح امید" کے نام سے ایک جلسہ میں پڑھی۔ شوکتِ الفاظ، اور زورِ بیان کا عالم ایسا ہوتا کہ جوش و خروش کا بحرِ بیکراں ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے۔ کوئی جلسہ ان کی نظم کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت کالج کے بام و در ان کے ترانوں سے گونج رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ تمھاری عظمتوں کے چراغ ابھی گل نہیں ہوئے ہیں۔ صرف روشنی مدہم پڑ گئی ہے۔ ذرا اپنے دلوں کو دوبارہ حرارتِ ایمان سے گرما کے تو دیکھو، دنیا کے منصب امامت کا تمھارے سوا اور کون مستحق ہو سکتا ہے۔

۱۸۸۷ء میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا مضمون لکھنؤ میں منعقدہ "اینگلو محمڈن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" میں پڑھا۔ مقالہ کیا تھا مسلمانوں

کے بخت خفتہ کا مرثیہ تھا، اس وقت ان کی شہرت اور مقبولیت کالج کی حدود سے نکل کر تمام ملک میں پھیل رہی تھی۔ ان کی ذات ستودہ صفات علی گڈھ کے لئے مایۂ صد ناز بن گئی۔ ان کی زندگی کا آغاز بحیثیت مورخ یہیں سے ہوا۔

۱۸۸۷ء میں "المامون" ۱۸۹۰ء میں "سیرۃ نعمان" شائع ہوئیں۔ نظم ہو یا نثر قلم کا رہوار پرواز خیال کی ہر ایک وسعت پر رواں دواں تھا۔ ۱۸۹۲ء میں بلاد اسلامیہ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ جانے کی تقریب "الفاروق" کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں مواد کی فراہمی تھی۔ مصر، شام، بیت المقدس کے کتب خانوں کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا۔ قسطنطنیہ اور بیروت بھی گئے۔ وہاں کے مشہور عالموں اور لیڈروں سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ اسی سال نومبر میں علی گڑھ واپس آگئے۔ یہاں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو اس وقت طالب علم تھے ان کی مدح میں ایک فارسی نظم کہی جس کا ایک شعر ہے۔

زینت ہر بزم و زیبِ انجمن آید ہمی
آں ادیب و شاعر و ہسٹورین آید ہمی

اسٹاف کی جانب سے ڈنر دیا گیا مولانا نے ایک ترکیب بند پڑھا۔

از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج برسید
یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد

اس دوران میں شمس العلماء کے خطاب سے بھی نوازے گئے۔

اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کیا ۱۸۹۴ء میں مطبع مفید عام آگرہ نے اسے

شائع کیا۔ ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۸ء مولانا کی شہرت بحیثیت مورخ کے بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس زمانہ کی تصانیف میں "کتب خانہ اسکندریہ" الجزیہ" اسلام میں ذمی رعایا کے حقوق" شامل تھے، سید مصباح الدین لکھتے ہیں کہ :۔

"ان مضامین نے تحقیق و تدقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی۔ "الفاروق" کی اشاعت سے پہلے ہی اس کا غلغلہ ہندوستان میں بلند ہو چکا تھا"

یہ کتاب ۱۸۹۴ء میں لکھنی شروع کی ۱۸۹۸ء میں ختم کی۔ کالج کی علمی مجالس نے ایک بڑا جلسہ کیا۔ حالی نے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ سرسید نے بھی ان کی علمی خدمات کو سراہا۔ اور مذکورۂ بالا معرکہ آرا کتابوں کی تالیف پر انھیں مبارک باد دی۔

بلادِ اسلامیہ کے سفر کے بعد شبلی نے علی گڈھ سے ترک تعلق کر لیا۔ کیوں کہ بلادِ اسلامیہ میں اُنھوں نے دیکھا کہ دنیائے اسلام پر مصائب و آلام کے جو پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں ان سب کے ذمہ دار انگریز تھے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ انگریز مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی اور ثقافتی مرکز کو سیاسی حربہ کے طور پر اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تاجِ برطانیہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی نمائندگی علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کر رہے تھے۔ اس وقت علی گڈھ کے بام و در پر جو تکدر کی فضا چھائی ہوئی تھی وہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ سرسید کا انتقال ہوتے ہی شبلی نے بھی اپنا استعفا پیش کر دیا۔ علی گڈھ کی محبت و مودّت اور اس کی عظمت کا اعتراف کیسے بھرپور الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ تعلیمی یا علمی قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشو و نما، اس کی

نمود، اُس کا امتیاز جو کچھ ہوا وہ یہیں سے ہوا۔"

محض نظریاتی اور اصولی اختلاف کی بناء پر علی گڈھ سے علٰحدہ ہو کر اُنھوں نے بہت بڑی قربانی دی۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ علی گڈھ ملّت اسلامیہ کی آرزوؤں اور امیدوں کا کعبۂ مقصود بنا ہوا تھا۔ یہاں کے پلیٹ فارم سے جو آواز اُٹھتی اُس کی بازگشت دور و نزدیک سب جگہ سے سُنی جا سکتی تھی۔ اور اس سے وابستگی حبِّ قومی کی سب سے بڑی سند مانی جاتی تھی۔ ۱۶ برس کی مدت میں وہ یہاں کی زندگی میں کچھ اس طرح سے رچ بس گئے تھے کہ قومی و ملّی نقطۂ نظر سے شبلی کی علٰحدگی کو بہی خواہانِ ملّت نے ایک عظیم نقصان سے تعبیر کیا۔ بات یہ ہے کہ اپنے تبحّرِ علمی کے اعتبار سے ان میں "انا" کا وہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وقت کا کوئی سا تقاضہ انھیں مصلحت جو بننے پر آمادہ نہ کر سکا۔ "یہ عنقا شے" دنیا کے ہر ایک عہد میں صرف چند وارفتہ مزاج لوگوں کے حصّہ میں آتی ہے۔ ہر کس و ناکس کا یہ کام نہیں کہ اس بارِ امانت کو حرزِ جان بنا کر رکھ سکے۔ زندگی کا یہ نیا موڑ ان کے لئے مالی اور ذہنی دونوں اعتبار سے سخت آزمائش کا تھا۔ ظاہر بیں نگاہوں میں ان کی علمی و ادبی شخصیت کا چاند گرہن میں آ گیا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ قدرت نے شبلی کو جس کام اور مقام کے لئے منتخب کیا تھا اس کو اعظم گڈھ کی پُرسکون فضا ہی سازگار ہو سکتی تھی۔ اعظم گڈھ میں "شبلی منزل" کے نام سے ایک چھوٹا سا بنگلہ تعمیر کیا۔ اور ان علمی سرگرمیوں کا آغاز کیا جن کی وجہ سے وہ ایک عدیم المثال مورّخ۔ مشہور شاعر۔ ادیب اور تنقید نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اصناف ادب کے جملہ موضوعات ان کی جودت، جولانیِ طبع کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے تھے۔

باوجود خطاب یافتہ ہونے کے انگریز کی مدح سرائی سے ہمیشہ احتراز کیا۔ "شہر آشوبِ اسلام"، "جنگ بلقان" جیسی معرکہ آرا نظمیں لکھیں۔ ہدف ملامت کون تھا یہ دنیا جانتی ہے، ان کے سیاسی عقائد سے جو لوگ متاثر ہوئے ان میں مولانا ظفر علی خاں۔ سید محفوظ علی بدایونی۔ اور بلدرم۔ جیسے لوگ بحیثیت ادیب اور صحافی تمام ملک میں مشہور ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ ابوالکلام آزاد انھیں کی دامن تربیت سے فیضیاب ہوکر نکلے اور پورے برصغیر میں اپنے نامور استاد کا نام روشن کیا، شبلی، ایک عرصہ تک "ندوۃ العلماء" میں شامل رہے، ان کے دور میں قدیم وجدید خیالات کے علماء میں جو کشمکش اندرونی طور پر جاری تھی جس کی وجہ سے وہ کوئی تعمیری اور قومی کام متحد ہوکر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بڑی حد تک ختم ہوگئی۔ ان کی ذات گرامی دو مختلف نظریات کے درمیان سنگم بن گئی تھی۔ ایک جانب انگریز سے نفرت جزو ایمان۔ دوسری جانب اہل کتاب سے اتحاد دینی اور دنیوی دونوں نقطۂ نظر سے جائز اس دوعملی سیاست کا خاتمہ کرکے اُنھوں نے جو بین بین راستہ اپنے لئے بنایا وہ بہت زیادہ مفید ثابت ہوا۔ شبلی ان تمام مقاموں سے اونچے ہیں جو وقت اور زمانہ نے ان کے لئے تجویز کئے تھے۔ وہ خود ایک کامیاب معلّم یا مشہور لیڈر بن جاتے تو وہ چشمۂ فیض کون جاری کرتا جو صرف شبلی اسکول سے متعلق ہے۔ دنیا کے وہ تمام لوگ جنھوں نے تا زیست انسانی اور قومی بھلائی کے لئے اپنی زندگی وقف کی ان کی بڑائی کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اُن کے مفید کاموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا روشنی کا جو منارہ وہ نصب کر جاتے ہیں اس سے گم کردہ راہوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت نے ہمیشہ زندگی کا سراغ لگایا ہے بحر کی وسعتیں اس کی بزرگی کی علامت ہیں۔ بلکہ اس کا ثبوت تو وہ گردش پیہم کا عمل

ہے جو ہمہ وقت اس کو بے قرار و بے چین رکھتا ہے۔ شبلی نعمانی کا فیضان ان کے مکتبۂ فکر کی صورت میں ہنوز جاری ہے۔

نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تشریح کی ہے کہ انھوں نے "ندوۃ العلماء کے قالب میں تازہ روح پھونکی[1]۔ ندوہ میں قدم رکھتے ہی رنگِ محفل ہی کچھ سے کچھ ہو گیا۔" الندوہ" کے نام سے ایک رسالہ ان کی ادارت میں جاری ہوا۔ نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "الندوہ میں جس پایہ کے مضمون نکلے ان سے اہل ذوق واقف ہیں۔ یہ مضامین ادب اردو کے لئے بہترین سرمایۂ ناز رہیں گے۔" ۱۹۱۲ء میں "مسلم گزٹ" کے نام سے ایک اخبار نکلا۔ اس کے صفحات سیاسی مباحث کے لئے وقف ہوتے تھے مسلمانوں کے لئے "وفاداری بشرط استواری" کی ہر ایک دفعہ پر خط تنسیخ کھینچا جاتا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ مسلم گزٹ کے پرجوش مضامین نے مسلمانوں کی سیاست کا رُخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں۔ میر محفوظ علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انداز صحافت پر شبلی کا رنگ غالب ہے۔ ان کی قائم کردہ "دارالمصنفین" کی وقیع خدمات اُردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ شبلی اسکول نے فکری اور مقصدی ادب، تخلیق، تصنیف اور تالیف کر کے جو مثال قایم کی تھی۔ اسی نہج پر آئندہ لاتعداد علمی اور تحقیقی ادارے ٹھوس اور سنجیدہ ادب پیدا کرتے رہے۔

---

[1] مقالات شروانی ص ۱۷۲

باب یازدہم

اکبر الہ آبادی

تعلیمی ترقی کی رفتار جس سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اُس کی بنا پر لوگ خوش تھے کہ قوم تہذیب یافتہ ہو رہی ہے۔ لیکن لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی اس خیال سے مضطرب اور بے چین تھے کہ جو قدم اُٹھے ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ہمدرد ناقد کا رول اختیار کیا اور تا زیست ان کے اور علی گڈھ کے درمیان حد فاصل کھنچی رہی کسی منزل پر بھی سرسید سے ان کا سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ایک تحریک کا تن تنہا مقابلہ کرنا سچ پوچھو تو انہیں کا جی گُردہ تھا۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر جب کہ پوری قوم نے باستثنائے چند قدیم علماء کے علی گڑھ کو اپنا کعبہ مقصود بنا لیا تھا وہ "اودھ پنچ" کے صفحات پر اس کے مخالف کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ مصلحت جوئی کی کوئی سی شق ایسی نہیں تھی جو ان کے خیالات اور قلم پر پابندی عائد کر سکے۔ اُنھوں نے اپنے جام کو جس بادۂ عرفاں سے بھر رکھا تھا اُس کو بڑھ کر اُٹھانے کے لئے بڑے حوصلہ کی

ضرورت ہوتی ہے قلم کی روانی کا یہ عالم کہ معلوم ہوتا تھا قدرت نے تخلیقی قوتوں کا خزانہ اس فلسفی شاعر کے دماغ میں بھر دیا ہے مسلمانوں کی مابہ الاحتیاج حیثیت شاید برصغیر کے نقشہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئی تھی۔ ان کی تمام ملی و قومی خصوصیات ختم ہو گئی تھیں اور ان کے ادبار کی داستانوں کو تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا تھا تاکہ آنے والی نسلیں پڑھیں اور عبرت پکڑیں۔ وہ یہ بھی دیکھیں کہ جب کسی قوم کی غفلت شعاریاں حد سے گذر جاتی ہیں تو برق آشیاں کو خاکستر کر کے چھوڑتی ہے۔

اکبر قضاؤ قدر سے شکایت کر رہے ہیں کہ امامت کا منصب مسلمانوں سے کیوں چھین لیا گیا۔ کیسے درد سے کہتے ہیں کہ :-

نہ خود رہے نہ حکومت رہی مسلماں کی
کہانی ہو گئی وہ سلطنت پرستاں کی

دہلی میں دربار ہوا یہ بھی بلائے گئے لیکن سوز نہانی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا کہتے ہیں۔

بیرنگی بارنگی دیکھی، دہر کی رنگا رنگی دیکھی
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوہ
میرا حصّہ دور کا جلوہ
محفل اُن کی ساقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا
اُوج برٹش راج کا دیکھا سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا

شہر میں جو بھی سرکاری یا نیم سرکاری تقریبات ہوتیں۔ لسان العصر ضرور مدعو کیے جاتے۔ پاس وضع داری میں چلے تو جاتے لیکن نہ اپنوں کی انکساری اور اور ہیچمدانی دیکھی جاتی نہ حکومت کے نشہ میں سرشار حاکموں کی کج ادائیاں برداشت ہوتیں۔ کڑھتے اور خون کے آنسو بہاتے، لکھتے ہیں:۔

دعوتیں۔ انعام۔ اسپیچیں۔ قواعد۔ فوج کیمپ
عزتیں۔ خوشیاں۔ امیدیں۔ احتیاطیں۔ اعتبار
پیش رو شاہی تھی۔ پھر ہز ہائینس۔ پھر اہلِ جاہ
بعد ان کے شیخ صاحب، اس کے پیچھے خاکسار

سرسید کی تعلیمی کوششوں کو وہ اس لئے بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کر کے اپنی قومی روایات اور عظمت کی داستانوں کو بھولتے جا رہے تھے۔ اپنے آباؤ اجداد کے علمی کارہائے نمایاں پر فخر کرنے کے بجائے یورپ سے متاثر ہو رہے ہیں کہتے ہیں کہ۔

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے
فخریہ آپ سنانے لگے نظمِ ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں مرے تھے اے دوست
آپ کے کون تھے ملٹن یہ کہو حضرتِ من!

انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی کلچر اور تہذیب بھی ملک میں تیزی سے پھیل رہی تھی۔ مسلمان روز بروز اپنے مذہب کی تعلیمات سے بیگانہ ہو رہے تھے لکھتے ہیں:۔

نہ تو انگریز بنے اور نہ مسلمان رہے
عمر سب ہفت میں کھوئی کئے نادان رہے

حضرت اکبر میرے کس کام کے
ہیں تو مسلمان مگر نام کے

کہتے ہیں وہ کہ اکبر کچھ باؤلا ہوا ہے
مذہب میں بات کیا ہے مسجد میں کیا دھرا ہے

برٹش سے وفاداری کے صلہ میں چھوٹے بڑے خطابات دینے کا رواج سا پڑ گیا تھا۔ خود انھیں بھی یہ اعزاز ملا۔ لیکن پھر بھی ان کی خفگی دور نہ ہوئی۔ کچھ اس طرح روٹھے تھے کہ کسی کے منائے نہ منتے۔ لاکھ دام بچھائے گئے لیکن وہ ہر ایک مرتبہ صاف بچ نکلے۔ چاپلوسی اور تملق اُن کی افتادِ طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ کہتے ہیں:۔

آنر کے ساتھ نام گرامی بھی لکھ گیا
لیکن ادھر سے خطِ غلامی بھی لکھ گیا

ترقی ہو الٰہی شاہدِ مغرب کے جوبن کی
عجب خوش فعلیاں ہیں آج کل شیخ و برہمن کی

کہا گردوں نے نہیں غیر ضروری یہ بات
اپنے مٹنے کا بتدریج تماشہ دیکھو

نئی تعلیمی تحریک کا ایک گھر میں چرچا ہے گرتے ہوئے کو تنکے کا سہارا مل جائے تو غنیمت ہے یہی حال اس وقت ہماری ملّت کا تھا۔ رنجور و مہجور مصئوب و مقہور جنگ پلاسی میں خواری سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامیابی تک مسلسل پستی میں گرتے رہے۔ زندگی کی راہوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔

سرسیّد نے روشنی کی جو کرن دکھائی تھی۔ گرتے پڑتے اُس کے پیچھے ہو لئے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ لوگ جس چیز کو قند مکرّر، سمجھ کر چکھ رہے تھے۔ اکبر کے خیال میں زہر تھا۔ اپنی اپنی نظر ہی تو ہے۔

اُن کی رائے میں مسلمان خردمی کی اس منزل سے دور اور بہت ہی دور جا پڑے تھے رسمِ دنیا یہ تو نہ ہونی چاہیئے کہ نگاہیں ہمیشہ سوئے آسمان ہی رہیں۔ بلکہ اردگرد کے نشیب و فراز کو بھی دیکھو۔ ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک۔ آمدِ فصلِ بہار کی تقریب میں طیور جو خوشی کے نغمے الاپ رہے ہیں اُن کو بھی تو سُنو۔ قدیم طرز کے علماء چاہے وہ بریلی یا بدایون کے ہوں اور چاہے دیوبند یا سہارن پور کے ہوں اُن کو چھوڑ کر پوری قوم سرسیّد کے ہاتھ پر بیعت کر چکی تھی۔ ان لوگوں کے خلاف جو تیر اُن کی جانب پھینکے جاتے نشانہ پر نہ بیٹھتے۔ آخر لسان العصر بھی برملا اظہار تمنا کرنے پر مجبور ہو گئے قوم اور سرسید دونوں پر کیسا لطیف طنز کر گئے ہیں۔

ہے یہی بہتر علی گڈھ جا کے سیّد سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

جو لوگ علیگڈھ کے طرفدار رہیں گے
اس دور میں بیشک وہی سردار رہیں گے

پھر کہتے ہیں :-

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علیگڈھ کے بھاؤ سے

نیچری عہدہ و منصب کو لئے پھرتے ہیں
شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لئے پھرتے ہیں

یہی فتویٰ ہے نیچر کا کہ ہم بھی ہو رہیں اُن کے
زر اُن کا زور اُن کا۔ علم اُن کا سلطنت اُن کی

انگریزی تعلیم کے نتیجے میں اُردو بول چال میں انگریزی الفاظ کا استعمال بڑھتا جاتا ہے۔ غالب اور میر کی زبان کے پہلو میں ایک بدیسی اور غیر مانوس زبان جگہ پائے، اس کو بگڑتے دیکھنا وہ کیسے گوارا کر لیتے۔ فرماتے ہیں :-

بابو کہتے ہیں وہ تہ جائے گا میرے انڈر میں کام کرتا ہے

اب تو رکھ دی گئی تہہ کر کے ادب کی چادر
پہلے قبلہ تھے تو اب صرف ڈیر ہیں فادر

اپنی زبان خاص پر انھیں فخر تھا اس کو نوکِ پلک سے درست کرنے میں اُنھوں نے زندگی کے بہت سے قیمتی اوقات صرف کیئے ہیں۔ کہتے ہیں :-

شیخ کے پاس ہے بس ایک مصلّیٰ باقی
اور میرے پاس ہے اردوئے معلّیٰ باقی

اکثر وہ محسوس کرتے کہ ان کی روش عام سے علیٰحدگی کو لوگ پسند نہیں کرتے، اس کیفیت کو یوں لکھتے ہیں :-

اکبر کی خرافات سے ناخوش ہوئے ایسے
نامہ ہے نہ پیغام نہ حصّہ ہے نہ بخرا

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دِل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

آخری زمانہ میں سرسیّد کی مخالفت کم کر دی تھی۔ مولانا عبدالرزاق کان پوری لکھتے ہیں کہ :-

"ایک موقعہ پر میں نے ان سے سوال کیا
کہ آپ جیسے مذہبی شخص نے ظریفانہ شاعری کیوں
اختیار کی اور سرسیّد کے خلاف کس بناء پر
لکھنا شروع کیا، ہنس کر فرمایا کہ یہ رنگ

Taj Tahir Foundation

"اودھ پنچ کے مضامین پڑھ کر پیدا ہوا تھا۔

۱۹۲۱ء میں سوگوار ملّت اور غمگسار قوم ہستی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ موت نے طوطیٔ ہزار داستان کی زبان پر اپنی مہر سکوت ثبت کر دی۔ جانے والے نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ اس کی قوم کی کشتی موج منجدھار میں ہے یا خونخوار لہروں کے رحم و کرم پہ ہچکولے کھا رہی ہے۔

دل سے تا حد نگاہ
تیری آواز نہ تیرا پیغام

Taj Tahir Foundation

باب دوازدہم ۱۲

مولانا محمد علی جوہر

یقیناً فصلِ گل میں پھر نکل بھاگا ہے زنداں سے
وہی شورِ سلاسل ہے وہی دیوانہ آتا ہے

مذکورۂ بالا شعر میں جوہر نے اپنی ہنگامہ خیز سیاسی شخصیت کی خود ہی عکاسی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے محمد علی جوہر کو پیش کرنا ہماری بہت بڑی جسارت ہے اور ان کی ذات ستودہ صفات سے بے پناہ جذبۂ عقیدت و محبت کے باوجود ہماری یہ کوتاہ دستی ان کے حضور شرمساری کا باعث ہے۔ ؏

چشم بینا اور ہے چشم تماشہ اور ہے

چنانچہ ہم بادلِ ناخواستہ موضوع کی رعایت سے مجبور ہیں اور متوقع ہیں کہ جس اہلِ قلم کو ان کی مبسوط سوانح عمری مرتب کرنے کی سعادت نصیب ہوگی۔

وہ اس اہم قومی و ملّی فریضہ کو ادا کرے گا جس سے بدقسمتی سے ہم محروم رہے۔ اردو کے کچھ ادبا نے ان پر اب تک جو لکھا ہے وہ اس لحاظ سے تشنہ ہے، کہ اگرچہ گذشتہ کم و بیش تہائی صدی تک ہمارے قومی ادب میں انھوں نے ایک نئے نقطۂ نظر کا آغاز کیا اور اس دور کی تاریخ کا کوئی ورق ایسا نہیں جس پر ان کی شخصیت کے نقوش ثبت نہ ہوں۔ پھر بھی اُن کا کام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ۔

ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ایک بہت بڑے مفکر کا قول ہے کہ :-

"جب اظہارِ رائے کے تمام ذریعے بند ہو جاتے ہیں اُس وقت بڑا تخلیقی ادب جنم لیتا ہے"۔

موسموں کی طرح ادب کے مزاج میں بھی تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے اور ایک دور ایسا آتا ہے کہ خیخوف کے الفاظ میں۔

"ادیب کو خوش الحان پرندہ کی طرح سے چہچہانے سننا اور دیکھنا پسندیدہ خیال نہیں کیا جاتا۔ سوچنے کا طریقہ۔ جنگ کی صعوبتیں تکلیفیں نیز ہر وہ چیز جس سے زندگی متاثر ہوتی ہے مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے"۔

بعینہٖ یہی مثال جوہر کے کلام و بیان پر منطبق ہوتی ہے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے اسلام، مسلمان اور وطن ان کے سوچ بچار کا محور و مرکز رہے دوسرے ذاتی مسائل محض ضمنی تھے کہتے ہیں۔

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں میں کہاں اور یہ وبال کہاں

ابتدا ہی سے طبیعت پر جو رنگ غالب تھا وہ وقت کے ساتھ پختہ ہوتا چلا گیا۔ معقول ملازمت پر فائز ہونے کے باوجود ایک انگریزی رسالہ میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ موضوع زیر بحث مسلم حقوق کا تحفظ تھا۔ اس وقت کے تمام زعماء محسن الملک، وقار الملک اور سر آغا خاں ان کی اعلیٰ علمی قابلیت، غیر معمولی ذہانت و فطانت اور پر زور انداز بیان کے دل سے معترف تھے اور وہ چاہتے تھے کہ محمد علی علیگڈھ کالج سے وابستہ ہو کر اپنی خداداد صلاحیتوں سے اسے مستفید و مستفیض کریں لیکن انگریز پرنسپل ان کے تقرر کی راہ میں سد سکندری بن کر حائل ہو گئے ایم۔ اے او کالج (علی گڑھ) برطانوی حکومت کا سب سے زیادہ محفوظ قلعہ سمجھا جاتا تھا جس کی چابی انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اس کی محفوظ چہار دیواری میں بیٹھ کر مسلمانوں کو سیاست حاضرہ سے علیحدہ رکھنے کے منصوبے بنائے جاتے۔ وفاداری کے اسباق رٹائے جاتے۔ مارلین کی خدائی کا سکہ چلتا تھا جو کھلے بندوں تلقین کرتا کہ:۔

"مسلمان مطالبۂ حقوق کی بجائے اپنی قسمت میکڈانلڈ (گورنر یوپی) کے ہاتھوں میں دیدیں تو یہ اُن کے لئے زیادہ بہتر ہوگا"

جس جگہ یہ کیفیت ہو وہاں قومی سیرت کی تشکیل کا خواب ذرا مشکل ہی سے شرمندۂ تعبیر ہوا کرتا ہے۔ مولانا محمد علی کے لئے یہ صورت حال سخت ناقابل برداشت تھی جس کو بدلنے کے لئے انھوں نے قلمی جہاد کیا اور کھل کر مذکورہ بالا نام نہاد قومی پالیسی کے خلاف کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے "کامریڈ" کا اجراء اس سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔

اُنھوں نے اپنے زورِ قلم سے ان تمام رشتوں اور رابطوں کو توڑ کر رکھ دیا جو شملہ اور علی گڑھ کے درمیان قائم کئے گئے تھے۔ بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ میں جمہوری خیالات کی تبلیغ کر کے دعوتِ فکر و انقلاب دی۔

تاریخ کا یہ دَور دنیائے اسلام کے لئے سخت آزمائش کا تھا برطانوی ملوکیت کا بھوت مسلمانوں کو آگ و خون کے دریا میں ڈھکیل کر خود ہر طرح مست و مگن تھا محمد علی جوہر اور ان کے رفقائے کار کی سعی پیہم کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا ساری احتیاطوں کے باوجود ترقی پسند خیالات رکھنے والے نوجوانوں کی خاصی تعداد میدانِ عمل میں نکل آئی۔ اور پورے مطلعِ سیاست پر چھا گئی۔ محمد علی جوہر اس گروہ کے سرخیل قرار پائے۔ حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آیا ہوا تھا جس قوم کے افسانوں سے اس کو ہمیشہ بوئے خون آتی رہی۔ اسی کی نئی نسل سرکبف ہو کر وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ قومی تحریک میں نوجوان طبقہ کی شمولیت اس کے نقطۂ عروج کی ضامن ہوتی ہے۔

اب داستانِ ایں و آں کا ہر ایک ورق طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جاتا ہے اور حقوق کے واگذاشت کی جدوجہد پرشکوہ ایوانوں اور نرم قالینوں پر بیٹھ کر یا باہمد گر طبع آزمائیوں سے نہیں کی جاتی۔ مطالبوں کی فہرست وہ اپنے لہو کی بوندوں سے مرتب کرتے ہیں۔ استبداد کے چیلنج کا جواب تختہ دار پر چڑھ کر دیا جاتا ہے، زور بازو کی آزمائش کے لئے سینہ پر گولیاں کھانے کی رسم ڈالی جاتی ہے اور زندان کی تاریک کوٹھریوں میں بیٹھ کر لڑائی کے نقشے بنائے جاتے ہیں ؎

کیسا پر لطف وہ افسانۂ غم ہوتا ہے
جو میرے خون کی سرخی سے رقم ہوتا ہے

اغیار اور مصلحت جو لوگوں کے صد ہزار ہتھکنڈے ان کی شوریدہ سری کے سامنے بیکار محض رہتے ہیں۔ ابتدائے عشق ہی سے جب یہ حال ہو تو اس کی انتہا کیا ہو گی۔ اس خیال ہی سے دشمن کی صفوں میں بزدلی چھا جاتی ہے اقتدار رفتہ کی باز یافت کے لئے "کامریڈ" کو روپیہ دے کر اس کی سرپرستی کی گئی۔ لیکن اس کے ایڈیٹر کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔

ع۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

نتیجہ یہ کہ اعانت سے ہات کھینچ لیا گیا۔ ایسا جریدہ جس نے مسلمانوں میں باغیانہ خیالات کی تبلیغ کر کے ان کی وفاداری کو شک و شبہ میں ڈال دیا ہو۔ اس کو زندہ رکھنے کی معاونت بمنزلہ کفر کے تھی۔ لیکن حضرت جوہر عقل کو اس درجہ نذر جنون کر چکے تھے کہ۔ مات پر مات کھاتے لیکن تصور کرتے کہ ہم ہی جیت رہے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں دہلی سے "ہمدرد" جاری کیا۔ ٹرکی کی شکست کی خبریں آ رہی ہیں۔ ان کا اضطراب اور بے چینی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ "کامریڈ" میں ترکوں کا فیصلہ" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون چالیس گھنٹہ کی نشست میں سخت علالت کی حالت میں لکھا۔ غذا میں صرف قہوہ دیا جاتا تھا۔ پورا ملک بلا تخصیص مذہب و ملت ترکوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انگریزوں نے جنگ کا اعلان کیا ہے مسلمانوں کی پسپائی کی خبریں مسلسل آ رہی ہیں۔

کامریڈ و ہمدرد کے ایڈیٹر کا قلم دودھاری تلوار بنا ہوا تھا ہر دو اخباروں سے ضمانت طلب کر لی گئی اور ان کو طویل زمانہ تک کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ ان کے زبان و قلم پر پہرے کیا بیٹھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماحول سو گیا ہے۔ دنیائے صحافت پر مردنی چھائی ہوئی تھی شعلہ نوائیوں کے لئے ان کا سا دل پرسوز کوئی کہاں سے لاتا۔ زخم پر

زخم کھانے کا حوصلہ ہر کسی کو تو نہیں ہوتا۔ اصناف ادب میں قومی ادب کو مخصوص اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ چونکہ وہ ہنگامی حالات کے تحت تشکیل پاتا ہے۔ اس کی اساس تجربہ۔ ذہانت اور غیر معمولی جوش و خروش پر ہوتی ہے۔ مضمون کے خالق کی سعیٔ بلیغ اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ جس قومی و ملی جذبہ سے سرشار ہو کر اس نے اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ وہی سیمابی کیفیت قاری کے دل میں بھی پیدا ہو جائے۔

محمد علی جوہر جیل کی چہار دیواری میں بند ہیں۔ کارکنان سیاست و تدبیر اطمینان کی سانس لے رہے ہیں۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ آزادی کے متوالے ہر حال میں آزاد ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

یہ نظر بندی تو کلی ردِ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا فریب — حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے

زندان کے باشی اپنے روز و شب جس تسمم کی کلفتوں اور ذہنی آسودگیوں میں بسر کرتے ہیں وہ کوئی ان ہی کے دل سے پوچھے مظلوموں کی آہوں کا دھواں اس کی فضاؤں کو سدا غمناک بنائے رکھتا ہے، اس دنیا میں موسم گل کی خبر کبھی نہیں آتی طوق و سلاسل کی جھنکار میں شور عنادل ڈوب کر رہ جاتا ہے موسم بہار یہاں سے ہمیشہ دبے پاؤں گذر جاتا ہے ؎

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی — ہمارے جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا

محمد علی جوہر کے تیور دیکھ کر دشمن تک حیران و ششدر تھے۔ کتاب اللہ کے مطالعہ میں استغراق اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ گرد و پیش کی انھیں کوئی خبر ہی نہ رہی۔ تنہائی نعمت غیر مترقبہ ہو گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں

جس مقصدِ عظیم کے لیے اُنھوں نے یہ پُرخطر راہ اختیار کی تھی اس کے مصائب کو وہ اپنے لیے کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن سے سوا کی آرزو رکھتے تھے۔

مستحقِ دار کو حکمِ نظربندی ملا　　کیسے کیسے یہ رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

قید اور قید بھی تنہائی کی　　شرم رہ جائے شکیبائی کی

۱۹۱۸ء آخر ہوا چاہتا ہے مولانا کو محبوس و نظر بند ہوئے تقریباً چار سال گذر چکے تھے "لائف آف محمد" اور "کامن ویلتھ آف اسلام" نامی کتابیں لکھنی شروع کیں "نیگ اینڈ یا" میں اس سلسلہ میں مسٹر سی ایف۔ اینڈریوز سے خط و کتابت بھی ہوئی لیکن ہر دو کتابیں پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو صدہا ہزار ہنگامے ان کی آمد کی راہ تک رہے تھے۔ ملک سیاسی طور پر ایک نئے موڑ میں داخل ہو چکا تھا۔ باہر نکل کر ان کے دو سال اس عالم میں گذرے کہ ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مسئلہ خلافت۔ جلیان والا باغ کا حادثۂ فاجعہ پورا ملک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ انگریز کے خلاف بغاوت کرنا مذہبی اور قومی فریضہ قرار پایا سیاسی مناسبت سے قیادت کی باگ، وقت کے اُس سب سے بڑے باغی کے ہاتھ میں دی گئی۔ جس کا نام محمد علی جوہر تھا۔ تحریک عدم تعاون اقطاع ملک میں زور شور سے جاری تھی انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ بھی اس میں شامل تھا۔ محمد علی نے اس مہم کی ابتداء

علی گڈھ سے کی فرزانۂ روزگار لوگوں کی یہ دنیا دیوانوں سے بھی خالی نہ تھی جو بقول علامہ اقبال ہمیشہ ستاروں پر کمند ڈالنے کی تگ و تاز میں لگے رہتے ہیں چنانچہ کثیر التعداد طلباء اور پروفیسران کے ہم نوا ہو گئے۔ اور ایک متوازی تعلیم گاہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے قائم کر دی گئی۔ رشید احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"یونیورسٹی سے قریب ہی ایک وسیع بنگلہ میں" مولانا نے جامعہ قائم کیا۔ ان کی بے پناہ ہستی کم سے کم مدت میں جو کچھ کر سکتی تھی وہ سب موجود تھا۔ ایک دن میں بھی جا نکلا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہنگامہ برپا تھا۔ اور اس سب کا مرکز مولانا تھے۔

مرہم کی جستجو انھیں کہاں سے کہاں لے گئی۔ ان کے نعروں کی گونج نے کس کس کے محلوں کے کنگرے گرا دیئے۔ اس کا نتیجہ وہی کچھ ہوا جس کی کہ توقع کی جا سکتی تھی۔ دو سال کے لئے پھر جیل کی چہار دیواری میں بند کر دئے گئے ؎

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب اشک باری کا حکم جاری ہے

محمد علی جوہر بغاوت کے مجرم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں انگریز جج کے روبرو کھڑے ہیں۔ کمرۂ عدالت ان کے نعرۂ انا الحق سے گونج رہا ہے کہتے ہیں:-

"آج میں جس جگہ کھڑا ہوں اس مقام پر مجھ سے پہلے عیسیٰ اور سقراط جیسے برگزیدہ لوگ کھڑے ہو چکے ہیں، اگر حق پر ہی تمھارے قانون میں ارتکاب جرم کے مترادف ہے تو ہم یہ چیز ہزار بار کرنے کو تیار ہیں۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے۔ جب خدائی قانون نافذ ہوگا ہم محتسب اور تم معتوب ہو گئے۔"

پھر اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ :-

"میرے پاس ایک تمدّن ہے ایک ضابطۂ اخلاق ہے۔
زندگی کا ایک نظریہ ہے اور حیات اجتماعی کے لئے ایک نظام
جس کو اسلام کہتے ہیں"

لوگ ایک ایک لفظ پر احسنت کے پھول نچھاور کر رہے ہیں اسی انداز کے ولولہ انگیز بیانیہ سے انقلاب کی سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ لاتعداد ہاتھ بندقیں کھولنے کے لئے دراز ہو جاتے ہیں اور راج سنگھاسن ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے۔

شہریاری کے سارے سپنے ادھورے رہ جاتے ہیں ؎

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
ایک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

اب بھی اتنا اثر ہے نالہ میں
حشر میں حشر ایک بپا کر دے

اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ :-

"ہم اور ہمارے ساتھیوں نے ذوق نغمہ میں کمی محسوس کر کے
جس قدر تلخ نوائی کی اور محفل کو گراں پا کر جس قدر خود ستائی کو تیز کیا اسے ہم
جانتے ہیں یا ہمارا خدا"

ان کا یہی دل نشیں اسلوب تھا جو عوام کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا اور وہ ایک آواز پر طاغوتی قوت سے نبرد آزما ہونے کے لئے آمادہ و تیار ہو جاتے۔ ہمدرد نئی

محمد علی جوہر جیل میں، دنیائے صحافت کی رونقیں ماند پڑی ہوئی ہیں، ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے تو "کامریڈ" اور "ہمدرد" پھر جاری ہو گئے۔ پریس خریدا گیا سابقہ عملے کے لوگ جہاں تہاں سے اکٹھا کر کے لائے گئے۔ "ہمدرد" کے دفتر میں ملک کے بہترین اہل قلم کا اجتماع ہے محمد علی، وقت کے کسی اہم مسئلہ پر اپنا اداریہ سپرد قلم کر رہے ہیں۔ ان کے دوست اور عقیدت مند چاہتے ہیں کہ وہ اپنی رفتار و گفتار میں تھوڑی سی لچک اور نرمی پیدا کر لیں۔ تاکہ یہ صحبت چند روزہ ثابت نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑے جی گردے کے انسان تھے۔ اپنے کاروبار حیات میں جوا بازی لگائی ہارنے اور مات کھانے کے لئے تھی جیتنے کے لئے نہیں۔ اقبال کے مرد مومن کے وہ مثالی پیکر، بے جھجک آتش نمرود میں کود پڑنے پر ان کا ایقان، اس درجہ پختہ ہو چکا تھا کہ اپنی اور رفقاء کار کی ہر ایک مصلحت اس پر قربان تھی۔ اکثر اوقات ان کی برق و رعد جیسی طبیعت کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا۔ جوہر اپنے قلم کی تلوار سے انگریز اور اس کے ہوا خواہوں کے سینے کچوکوں سے لہولہان کرتے وہ خوب سمجھتے تھے کہ ملی نقطۂ نظر سے ان کو اپنے اس راست اقدام کی قیمت دینا پڑے گی۔ اور یہ سارا کھیل چشم زدن میں بگڑ جائے گا۔ گلچیں کے ہاتھ ان کے چمن کو اجاڑنے پر ہمیشہ آمادہ و تیار رہتے۔

۱۹۲۹ء تک "ہمدرد" سسک سسک کر جیتا رہا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ مولانا نے لکھا۔

"صحافت کو میں نے کبھی منتہائے نظر نہیں سمجھا ایک ملک و ملت کی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھ کر اخبار نکالا لیکن یہ نئی راہ کافی حد تک سنگین تھی۔"

رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا کے کلام و بیان سے متاثر

ہو کر لکھا تھا کہ :-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلحہ خانہ میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا
شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے"

آخر میں ایک جان ناتواں باقی رہ گئی تھی اس کو بھی گنوا بیٹھے کہتے ہیں۔

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

بہار آنے سے پہلے ہی انھوں نے رخت سفر باندھ لیا ؎

دوانہ مر گیا آخر کو ۔۔۔ ویرانے پہ کیا گذری

اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ دماغ اور جسم ان کی زور طبیعت کا بار اُٹھاتے اُٹھاتے تھک چکے تھے۔ جیف وطن کی آزادی کا خواب ان کی زندگی میں پورا نہ ہوا۔

Taj Tahir Foundation

باب سیزدہم

مولانا ظفر علی خاں

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

مولانا کا شمار ملک کے ان عظیم رجال میں تھا جو جبلی خصوصیات کے اعتبار سے اپنے ماحول کے برعکس ہوتے ہیں۔ زندگی کی بنی بنائی شاہراہوں پر چلنے کی جستجو نہیں کرتے خود ہی رہبر۔ خود ہی رہرو، نشان زدہ منزلوں میں گامزن ہونا اپنے بلند عزائم اور ارادوں کے منافی سمجھتے ہیں۔ السانی کردار کے بننے یا بگڑنے میں ارسطو کا نظریہ عام لوگوں پر تو منطبق ہو سکتا ہے۔ ان جیسی شخصیتوں پر نہیں۔

مسٹر سارتر کے الفاظ میں۔

"یہ بے چین اور سیمابی طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں جو محض قدم اُٹھانے میں لطف محسوس کرتے ہیں"۔

علی گڈھ کالج نے لاتعداد ایسے باکمال پیدا کئے جنھوں نے دنیوی ترقی کے مختلف مراحل طے کر کے اس کا نام روشن کیا۔ علی گڈھ کی چھاپ لگتے ہی بفضلِ ربی خطاب۔ عہدہ۔ اعزازات کی صورت میں شامل حال ہو جاتا۔ عرصۂ دراز تک وہاں کی ڈگریوں کو نفع بخش سودے کے بطور استعمال کیا جاتا رہا لیکن مولانا نے کتابی درس کے علاوہ کتاب حریت کے بھی سارے اسباق ازبر کر لئے اور جب فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو طبیعت پر رنگ ہی دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ حب الوطنی اور حرارت دینی کا جذبہ ہر تار نفس میں سرایت کئے ہوئے۔ وقت کے ہر ایک فرعون سے نبرد آزما ہونے کے منصوبے سامنے تھے۔ جنوں کی حشر سامانیوں سے سر و بالِ دوش تھا۔ کسی نے اپنا دامن پھولوں سے بھرا۔ مولانا نے کانٹے چنے اور ہاتھوں کو لہو لہان کر لیا۔ یہ وہ وقت ہے کہ پنجاب میں انگریز سیاست کے سنہرے جال بچھائے بیٹھا ہے۔ بڑے بڑے دیدہ ور بہک کر اس میں پھنس رہے ہیں۔ لیکن مولانا ترغیب و تحریص کے کسی دام میں گرفتار نہ ہو سکے ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے نکلا نہ کوئی
اور ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

قدرت اس معاملہ میں ان کی پوری پوری دستگیری کر رہی تھی۔ خرقۂ امامت تفویض ہونے کے لئے ذہن و شعور کی تربیت کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔ عزم اور حوصلہ میں تجربہ کے بغیر پختگی نہیں آتی۔ مولانا کے لئے دکن کی زمین سنگلاخ کا انتخاب ہوا۔ ان کی صحافی اور سیاسی زندگی کا آغاز "دکن ریویو" سے ہوا۔ سولہ سال تک ان کی ادبی سرگرمیاں ایک محدود دائرہ کے اندر گھومتی رہیں۔ اکثر

مواقع ایسے آئے کہ اگر وہ چاہتے تو مقربان خاص میں شامل ہو کر جاہ و منزلت کی اونچی منزل پر پہنچ جاتے لیکن اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور تھے مصلحت کوشی سے ان کے مسلک و مشرب کو کیا واسطہ۔ ع

ہے پرے قوت ادراک سے اپنا مسجود

اسی دوران میں یوروپین تھیٹریکل کمپنی کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا۔ اودوائر کے اشارہ پر مولانا کو دکن چھوڑنا پڑا۔ بعض معاملات میں قضا و قدر کے اکثر فیصلے ہماری آرزوؤں کے قصر کو پاش پاش کر کے رکھ دیتے ہیں معلوم ہونے لگتا ہے کہ اب زندگی ناکامیوں اور مایوسیوں کے درمیان دم توڑ دے گی۔ لیکن بعد کو جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہی سب کچھ صحیح تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں "زمیندار" کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لیتے ہی ان کی زندگی کا وہ دور شروع ہو گیا۔ جس کی سرشت بنائی گئی تھی۔

مولانا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کی تاریخ صحافت میں اپنے مثالی کردار سے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ دنیائے ادب و شاعری کے آسمان پر آفتاب اور مہتاب بن کر چمکے اور اس فن میں ان کے قائم کردہ معیار کو حرفِ آخر کا درجہ دیا جائے گا۔

سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۲۱ء کے درمیانی وقفے میں ہندوستان کے مطلعِ سیاست پر گرد و غبار کے دل بادل چھائے ہوئے ہیں۔ وقت کی ہر ایک کروٹ نئے انقلاب کی نشاندہی کر رہی ہے۔ عالم اسلامی کی خستہ حالی اور پائمالی نے اپنی آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔ برصغیر میں برطانوی سامراج نے اپنے جابرانہ طرزِ عمل سے

مسلمانوں کے قلوب کو زخمی کر کے رکھ دیا۔ جنگ بلقان و طرابلس کے بعد ہی مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا۔ "الہلال" "زمیندار" "کامریڈ" اپنی تحریروں سے غیر اللہ سے نڈر رہنے کا جذبہ پیدا کر رہے ہیں۔ ان تینوں پرچوں کے اداریوں نے استعمار کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دیا ہے۔ مولانا کے دو محبوب موضوع تھے وطن اور اسلام۔ اتفاق کی بات انہی دنوں اوڈائر پنجاب کا گورنر ہو کر دکن سے آیا۔ یہاں مولانا کی سیاسی اور صحافی سرگرمیاں دیکھ کر آتش زیر پا ہو گیا۔ ادھر یہ ہیں کہ برطانیہ اور اس کے باجبروت نمائندہ کی پرواہ کئے بغیر کفن بردوش گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ حق کی ہر ایک آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور بے جھجک ہو کر آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ اس جوش و خروش مومنانہ کا پہلا ثمرہ ۱۹۱۵ء کی نظر بندی کی صورت میں ملا۔ پانچ سال تک محبوس رہے۔ لیکن زندان کی فلک بوس دیواریں اور محتسب کی کڑی نگاہیں مئے بیخرب کے متوالے کا نشہ نہ اتار سکیں۔

اوڈوائر کے منتقمانہ جذبہ کا یہ عالم کہ مولانا کا جیل سے باہر رہنا اسے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ ہر آن گھات لگائے بیٹھا رہتا۔ دوسری طرف مولانا اپنی شوریدہ سری کے ہاتھوں مجبور۔ "زمیندار" کے کالم اور مولانا کا قلم برطانوی اقتدار کا خاکہ اڑاتے انگریز کے ہر ایک وار کو بے جگری سے سہتے اور منہ سے آواز نہ نکلتی۔ کہتے ہیں کہ:-

کرم آباد کو سر مائیکل نے بنایا ہے مری علمی حوالات

پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ
اُمت مرحوم پر کیا کیا ہیں احسانِ فرنگ

ایک خاص بات یہ تھی کہ مولانا جیل میں ہوں یا باہر ان کی بھرپور شخصیت پوری تابانیوں کے ساتھ "زمیندار" کے صفحات پر جلوہ گر رہتی۔ التزام کرتے کہ جو شخص بھی اس کے ادارت کے فرائض انجام دے۔ وہ اس راہ کی گرانباریوں سے عہدہ برآ ہونے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اس کے مشن کے لئے کسی قسم کی قربانی دینے میں پس و پیش نہ کرے۔ اور اپنے روز و شب ہنگاموں میں بسر کرنے کا عادی ہو۔

اسی بناء پر اس کی ادارت قومی اعزاز تصور کی جاتی حالانکہ مالی منفعت کا جہاں تک تعلق تھا اس کے حصول کا کوئی سوال ہی نہیں تھا انھیں روایات کی بدولت کارپردازان حکومت تک زبان سے نہ سہی دل سے مدیر "زمیندار" کا احترام کرتے۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا دوبارہ جیل گئے۔ اب کے بار میانوالی کا زنداں اس علم بردارِ حریت کا مسکن بنا۔

لاتعداد نوجوان ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر کے ملک کے مشہور صحافی اور اہل قلم بن گئے۔ مولانا نے اصناف ادب میں بے شمار اضافے کئے اور جو کچھ دیا وہ اردو کا قیمتی سرمایہ ہے وہ جس موضوع کو بھی لیتے اس پر اس قدر حاوی ہو کر لکھتے۔ کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک واحد ادیب ہیں جو اس موضوع پر خامہ فرسائی کر سکتے ہیں۔ سیاست حاضرہ۔ اور عالم اسلامی کے مسائل پر جب قلمی کاوشوں سے دماغ تھک جاتا تو اس وقت مزاحیہ مضمون رقم کرتے۔ طنزیہ اشعار میں اکبر الہ آبادی کا رنگ غالب ہے۔ ملک میں مزاحیہ نگاروں میں تین مسلمہ ادیب مانے جاتے تھے ظفر علی خاں،

میر محفوظ علی اور ابوالکلام آزاد، مسٹر اور ملا دونوں ہی سے مولانا خوش تھے۔ ایک انگریز پہ ایمان لائے ہوئے تھے دوسرا ماسوا سے بے نیاز مسجد میں معتکف لکھتے ہیں کہ:-

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ ہم مسٹر نہ مولانا

میرزا جی کا خدا بھی خوب ہے جس نے انھیں
پہلے پیغمبر بنایا پھر لٹیرا کر دیا

علامہ اقبال، صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوئے مولانا نے مراحا لکھا۔ مجموعہ انقلاب کا اقبال دنوں ہیں"۔ پنجاب کے سرکار پرستوں کے نام کے ساتھ "کاسہ لیسان ازلی" لکھنے کی پہل انھوں نے کی۔ اپنے مسلک کی تشریح کے ساتھ علامہ اقبال کے اس اقدام کو رجعت قہقری پر محمول کرتے ہوئے لکھا۔

اگر آزادی کامل مرا پیدائشی حق ہے
تو کونسل میں گرجنا آپ کا آرائشی حق ہے

جب تک مولانا جیل میں رہے محفل ادب سنسان پڑی رہتی۔ آزاد ہوئے ہی سیاسی مشاغل میں پھر ڈوب گئے۔ صد ہزار ہنگامے کبھی سے ان کی راہ تک رہے تھے۔ گمان ہوتا تھا کہ میدان ادب کا یہ منچلا شہسوار ہو سکتا ہے کہ اپنی اڑائی ہوئی گرد راہ کا شکار ہو جائے۔ اردو کے لئے اس کی جدائی قیامت کی گھڑی سے کم نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب غبار چھٹتا اور مطلع صاف ہوتا تو دیکھا جاتا کہ وہ اپنی بھرپور ذہنی

اور شعور ہی توانائیوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نغمہ سنج ہیں۔

حالت اسیری میں دنیائے ادب سے طویل علیحدگی بعض اوقات خود انھیں گھلنے لگتی۔ لکھتے ہیں:۔

"قلم و دوات کی صحبتیں مجھے شاذ ہی میسّر آتی ہیں"

مولانا تہیدست ہوں یا تھوڑی سی فراغت میسر ہو دشمنوں کی یلغار ہیں ہوں یا دوستوں کے جھرمٹ میں، افکار و خیالات کے اعتبار سے جوش اور ولولہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ سالک مرحوم لکھتے ہیں کہ:۔

"سنہ ۱۹۲۷ء میں "زمیندار" کی مالی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ مجھے اور مہر صاحب کو قسطوں میں تنخواہ ملتی تھی۔ آخر تنگ آن کر عملہ نے ہڑتال کر دی"

مولانا کا یہ مسلک کہ ؎

میں صحافت کی ادارت بھی کیا کرتا ہوں
یہ خسارہ کی تجارت بھی کیا کرتا ہوں

اُس کا کوئی کہاں تک ساتھ دے۔ لیکن علائق روزگار کی زنجیریں اُنھیں جادۂ حق پر چلنے سے نہ روک سکیں۔ وقت کے ہر ایک نمرود سے نبرد آزما ہیں کہتے ہیں کہ:۔

سر کٹاتا ہوں میں ناموس مساجد کیلئے
آبِ خنجر سے طہارت بھی کیا کرتا ہوں میں

حب الوطنی کے جرم میں "سیفٹی ایکٹ" کے خنجر آبدار کو "قتل عاشقان"

Taj Tamir Foundation

کے لیے مسلسل استعمال کیا جاتا تھا۔ مولانا کا بالخصوص مشقِ ستم بنا روزانہ کے معمولات میں سے تھا لیکن انھیں اس کی پرکاہ برابر فکر نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ کا آئین پینل کوڈ پر غالب
مرے آئین کا ڈنڈا ہے اس قانوں کے سر پہ

سکام انگریز کو دنیا سے، مجھے دین سے ہے
اس کے قانون کی ٹکر میرے آئین سے ہے

میں بھی ہوں شیوۂ تسلیم و رضا پر قائم
اگر انگریز کا مسلک ستم آرائی ہے

آزادی کی تحریک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے۔ مادرِ وطن نوجوانوں کے تازہ لہو سے اپنی پیاس بجھانے کی خواہشمند ہے۔ یہ طبقہ جب لڑائی کا محاذ سنبھالنے نکلتا ہے اس وقت انقلاب ہر ایک دروازہ پر دستک دینے لگتا ہے۔ جد و جہد کی تاریخ ہمیشہ ان سے رقم ہوتی ہے۔ وطن کے فدائی بھگت سنگھ کے سانحہ پر ہر شخص خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مولانا کی بے چینی اور اضطراب بھی دیدنی ہے لکھتے ہیں:۔

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو بہہ نکلے
تو اُس کے ذرّہ ذرّہ سے بھگت سنگھ اور دت نکلے

عید کا چاند طلوع ہوا۔ ہر کہہ و مہ حسبِ استطاعت اس کی خوشیوں میں گم و محو ہوا ہے

لیکن مولانا کو غلاموں کی یہ خوشیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اداریہ لکھا:۔

ماتم کدۂ ہند میں اے عید نہ تو
ہم نیند کے ماتوں کو نہ سوتے سے جگا تو
بام و در کابل پہ بکھیرا اپنی تجلّی
کیا آ کے چکھائے گی سوّیوں کا مزہ تو

۱۹۱۵ء تا ۱۹۳۶ء مولانا کو اپنے روز و شب پر کوئی اختیار نہیں۔ احکام زبان بندی نافذ ہو رہے ہیں۔ خیالات پر پہرے بیٹھے ہوئے ہیں جس طرف جاتے ہیں سی۔ آئی۔ ڈی والے کرامًا کاتبین کی طرح ساتھ ہیں۔ لیکن وہ ہیں کہ جنوں کی ساری روایتوں کے ساتھ صحرا بہ صحرا پھر رہے ہیں۔ منزل تسلیم و رضا میں سر دینا ہی تو مجاہد کی معراج ہے۔ ع

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

لکھتے ہیں کہ:۔

کٹ مرنے کو ناموسِ نبیؐ پر ہوں میں تیار
وہ سر جو ہو اتن سے جدا میرے لئے ہے

ملک کی مشترکہ عظیم قربانیوں کے نتیجہ میں آزادی کا سورج طلوع ہو جانے کو ہے۔ مادر وطن کی آبرو بچانے کے لئے سب ہی نے سینہ سپر ہو کر گولیاں کھائی ہیں اور اس کی بیڑیاں کاٹنے میں اپنے ہاتھوں کو لہولہان کیا ہے لیکن یہ کیسی ناانصافی کی بات تھی کہ آزاد ہندوستان کے پس منظر میں اکثریت "اکھنڈ بھارت" کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ملّت کا ہر ایک فرد

اپنی جگہ دم بخود اور پریشان ہے۔ فلک پیر کے لئے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے قومی وجود کا صفحہ دہر سے مٹ جانا کوئی نئی چیز نہیں ہزار بار اس نے یہ المیہ وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے۔ قرطبہ کے کھنڈروں سے یونان اور صقلیہ کی دیواروں سے جاکر پوچھو اور دیکھ لو کہ کلمہ گویان اسلام پر وہاں کیا گذری۔

مسلمانوں کے بہترین دماغ اور آزمودہ کار سپاہی کانگریس کے روح رواں رہے تھے۔ آزادی کے ہر ایک محاذ پر ہندوؤں کے شانہ بشانہ لڑائیاں لڑی تھیں۔ اس مرحلہ پر یہ دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے ایک جداگانہ نظریہ کا حامی بن کر سامنے آیا۔ اور ملت بیضا کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ جو لوگ کانگریس سے علیحدہ ہوئے۔ ان میں مولانا بھی تھے۔ یہ دور مختلف النوع مسائل کے لحاظ سے ہمارے لئے بڑا ہی سخت تھا۔ ہندو پریس اور اہل قلم نے سخت معاندانہ طرز عمل اختیار کر رکھا تھا۔

"زمیندار" کے کالم ان کی چیرہ دستیوں کے دندان شکن جواب کے لئے وقف تھے۔ مولانا کے شعلہ نوا کلام و بیان نے دشمن کی صفوں میں ہل چل ڈال دی تھی۔ کہتے ہیں :-

وہ شدھی دوڑی جاتی ہے اور پیٹی جاتی ہے چھاتی
یا
عزتِ ملتِ بیضا کی حفاظت کے لئے
دوش پر لاکھ بھی سر ہوں تو کٹاتے جاؤ
ہر نغمہ سے پیدا ہوئی ملت میں نئی روح
میں جب سے ہوں اسلام کے گلشن میں نوا سنج

کانپتے تھے اس کی ہیبت سے زمین و آسماں جب مسلماں گھر سے نکلا باندھ کر سر سے کفن
ہند آزاد تو ہوگا مگر اس کی ہے یہ شرط کہ ہو گردن میں محمدؐ کی غلامی کی کمند

علم الدین شہید کے ایجی ٹیشن نے ملک گیر صورت اختیار کر لی ہے۔ مولانا اسٹیج پر شمشیر کی طرح گرج رہے ہیں۔

"ہم اس سقف نیلی فام کے نیچے۔ فلک کج رفتار کی قبائے زرنگار پر جگمگاتی قندیلوں کو گواہ بنا کر حلف اٹھاتے ہیں کہ انگریز حکومت کے کارکنان قضاء و قدر سے اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔"

ردّ قادیانیت اور مسجد شہید گنج پر مولانا نے جس قدر لکھا شاید ہی کسی دوسرے اہل قلم نے لکھا ہو۔ انھوں نے ہمیشہ کوہ آتش فشاں کے دہانہ پر بیٹھ کر اپنے افکار و آراء کو قلمبند کیا۔

ان کا فکری سرمایہ جس قدر کثیر تعداد میں ضبط ہوا اردو زبان کا کوئی دوسرا ادیب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لکھتے ہیں:۔

دل ضبط۔ زباں ضبط۔ فغاں ضبط
سُن لوگے عزیزو کہ ہوئے دیر و حرم ضبط

مولانا کے کلام و بیان پر تجربہ کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے دل پہ گذری ہوئی وارداتوں کو قلمبند کیا ہے۔ سُنی سُنائی باتوں کو نہیں۔ ان کی تحریر کو یہی چیز پر اثر بناتی ہے۔ وہ اردو زبان کے آسکر وائلڈ ہیں۔

باب چہاردہم

مولانا ابوالکلام آزاد

غالب۔ سرسید اور اقبال کے بعد جس قدر اہل قلم پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے وہ مولانا آزاد کی شخصیت ہے۔ ان کے عقیدت کیشوں اور والہانہ محبت کرنے والوں کی خاصی تعداد پاک و ہند میں موجود ہے۔ جنھوں نے ان کے متعلق جی کھول کر لکھا۔ مولانا نصف صدی تک دنیائے علم و ادب اور صحافت کے بے تاج بادشاہ رہے۔ اردو ادب کی تاریخ ان کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ گیسوئے اردو کو سنوارنے میں ان کے قلم نے زبردست مشاطگی سے کام لیا۔ یہ ساری کائنات اور اس میں پھیلے ہوئے لاتعداد ذرائع اور وسائل۔ زندگی اور اس کے متنوع تقاضے ہمیشہ وقت کے بہترین دماغوں کی قلمی موشگافیوں کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ ہر ایک مصنف نے اپنے پیرایۂ بیان کو زیادہ سے زیادہ پُراثر بنانے پر اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ لیکن شہرت اور بقائے دوام معدودے چند اہل قلم کے حصہ ہی میں آئی جنھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے ذہانت و فطانت

کے اس بیش قیمت عطیہ کے فیضان کا جو ہر ایک دور میں شاذ ہی کسی اہل قلم کے حصہ میں آتی ہے۔ مولانا اپنی علمی استعداد کے لحاظ سے اپنے ہمعصر ادیبوں میں ایک مقام خاص کے مالک ہیں۔ ان کی تحریروں میں سمندر جیسا جوش و خروش، بجلی کی سی چمک اور شعلوں کی سی لپک سموئی ہوئی ہے۔ اس صدی کے وہ پہلے ادیب تھے جو علم برداران حریت کی حیثیت سے "الہلال" کے صفحات پر نمودار ہوئے، ان کے قلم نے یاس و ناامیدی کے حصار تنگ میں محبوس ملت کو زندگی کا پیغام دیا اور بتایا کہ انگریزی تعلیم کے نتیجہ میں ایک محدود طبقہ کو جو عہدے خطابات اور اعزازات میسر آگئے ہیں وہ انسانی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کی جانب بڑھ جانے کا نام نہیں مسلمان کا فرض منصبی اور ضابطۂ حیات ایک عظیم مقصد کی جد و جہد کے لئے ہے۔ اور وہ ہے آزادی جو ہر ایک انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے۔ "الہلال" کے اداریوں نے وقت کے دھارے کا رُخ موڑا ان کی رعد آسا گرج کی بازگشت نے سامراجی اقتدار کے تار و پود بکھیر کر رکھ دئے، انھوں نے جس مسئلہ کو چھیڑا دل کے سارے ساز جھنجھنا اُٹھے مسئلہ خلافت ہو یا وطن کی آزادی کی بات درمیان میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش و خروش کا لاوا تھا جو مولانا کے نہاں خانہ میں بند تھا اور وہ اب اُبل پڑا ہے، خیالات الفاظ کے قالب میں ڈھل کر صور پھونک رہے ہیں۔ سارا عالم زیر و زبر ہوا جاتا ہے۔ ع

آخر تو کوئی لائیں گے آفت فغاں سے ہم

آزاد صنف ادب کے ایک کامیاب آرٹسٹ ہیں۔ وہ اپنے نوک قلم سے

جو تصویر اتارتے ہیں، جس جس زاویہ سے منظر کشی کرتے ہیں۔ دیدہ زیبی اور دل کشی کے سارے معیار انھیں کی بنائی ہوئی تصاویر پر پورے اترتے ہیں۔ مولانا آزاد کی نثر پورے طور پر شعری کیفیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اشعار کا برمحل استعمال اور فصیح الفاظ کو جس سلیقہ سے کام میں لاتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ خوبصورت عنوان سے موضوع کو دل چسپ بنانے پر وہ کبھی متوجہ نہیں ہوئے، خیالات کا تنوع۔ سحر آفریں الفاظ اور سب سے بڑھ کر ایک مثبت نصب العین کی نشاندہی قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کے لئے کافی سامان ہے۔

شوپنہار کہتا ہے کہ:-

"میں تمام بنی نوع انسان پر اپنے ذہنی اثرات ڈالنے
کے لئے پیدا ہوا ہوں"

مولانا کی تحریریں بعینہ اسی کلیہ پر پوری اترتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مذہبی تقدس کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا تھا، دین و دنیا کی سعادتیں بغیر کسی کسب کمال کے ان کی منتظر تھیں۔ عقیدت اور محبت کے پھول ان پر نچھاور ہونے کی راہ تک رہے تھے۔ ع

سب اُن پہ ہے تصدق وہ سامنے تو آئیں

لیکن فریب نظر کے یہ سارے سامان اُن کی بصیرت کو دھوکہ میں نہیں ڈال سکے اور وہ ان سے یہ کہہ کر جلد ہی دست کش ہو گئے کہ ؎

کام تھے عشق میں وے اے امیر ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے

Taj Tahir Foundation

خرقہ پوشوں کی جماعت نے سجادگی کو معراج قرار دیا اور مرجع خلائق بننے کے لئے اسے نسخۂ کیمیا گردانا لیکن مولانا کی استغنائی فطرت ان میں سے کسی ایک چیز کی طلب گار نہ بن سکی۔ ان کی دور رس نگاہیں ظلمتوں سے بھری دنیا اور لاتعداد آنکھیں اشک بار ہوتے دیکھ رہی تھیں جن کو ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ خانقاہی زندگی کے لوازم سکون و قنوطیت ہیں۔ طوفان سر سے گذر رہے ہیں لیکن یہاں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی موشگافیاں ہو رہی ہیں ؎

جز نغمۂ محبت سازم نوا نہ دارد

لیکن مولانا نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جو ایک مصلح وقت کے شایان شان تھا۔ شیوۂ اہل جنوں یہ ہے کہ جس منزل میں قدم رکھو سنگ و خشت کی پروا نہ کرو۔ خرد نے جب کبھی سر کو سلامت رکھنے کا مشورہ دیا شوریدگی و وارفتگی راہ نما بن گئی۔

ایک روسی مفکر لکھتا ہے کہ :۔

"جب اظہار رائے کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اس وقت بڑا تخلیقی ادب پیدا ہوتا ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سارے لافانی مدافع پارے، زنداں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے لکھے گئے ہیں۔ صیاد کے دام اور برقِ خرمن کی زد میں بیٹھ کر قلم میں غضب کی تیزی و تندی آجاتی ہے دکھے دلوں کی ساری دھڑکنیں اس میں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔

مولانا آزاد کی دو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر" اول الذکر کتاب رانچی میں نظر بندی کے ایام میں مرتب کی گئی ہے۔ اپنے خاندان کے

"تاریخی حالات تقریب بن جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام سنڈریلا، ہامان، ہلاکو اور چنگیز کے لرزہ براندام واقعات اور عیسیٰ اور سقراط کے مثالی کرداروں سے قارئین کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو بے نقاب کرنے میں ان کا قلم کائنات جیسی رموزیت اور اسراریت اختیار کر لیتا ہے۔ ع

در امید اسی آرزو میں بازہا

آخری باب کے صفحہ ڈیڑھ صفحہ میں اپنی ۵ سالہ ہنگامہ خیز زندگی کا بس یوں ہی ضمنی سا ذکر کر دیا اور احوال واقعی جاننے والوں سے یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

"غبار خاطر" میں ان کا فن پورے نقطۂ عروج پر ہے۔ اس کے صفحات پر جس شان سے وہ جلوہ گر ہوئے ہیں اس سے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ شخص میدان سیاست کا شہسوار ہے صبح کا جانفزا وقت ان کی مجلسِ طرب کے لئے مخصوص ہے۔ اہتمام یہ ہوتا ہے کہ داستانِ ایں و آں کا کوئی ساذ کر بجز شعر و ادب کے، درمیان میں نہ آئے۔ گل افشانیٔ گفتار کے لئے بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ رشتۂ فکر کی گرہیں کھولنے میں ان کا ادبی ذہن اور غیر معمولی حافظہ پوری طرح سے آمادہ ہیں۔ "قصۂ بادۂ و تریاک"، "داستان بے ستون و کوہکن" جب

مولانا رقم کرتے ہیں تو اس کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے "قلعہ احمد نگر کا اداس اور ویران ماحول منظر کو مزید سوگوار بنانے کے لئے اس کے احاطہ میں ایک شکستہ سی قبر۔ لیکن انھیں کے الفاظ میں "زمانہ کے سابہ سے جو بے ان کی افتاد طبع کے سامنے بیکار ہی تھے"۔ اور سرگشتۂ خمارِ رسوم کی ہر ایک قید سے مبرّا۔ مولانا محبوس زنداں ہیں۔ سال پر سال اس عالم میں بیتتے چلے جاتے ہیں لیکن نظر کی فطری وسعتوں نے معاملہ حیات کے ہر ایک پہلو کو ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے وہ اسے فرصتِ چند روزہ سے تعبیر کر کے بسا غنیمت جانتے ہیں۔

مولانا وحدتِ سیاسی کے ہمیشہ منادر رہے۔ جداگانہ نظریۂ قومیت کی ہر ایک دلیل ان کے لئے بیکار تھی۔ تقسیم کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا کہ ابتدا ہی سے اندیشہ تھا مولانا، اہل وطن کے دوش بدوش کھڑے تھے اور آزادی کے بعد ان کی سرگرمیوں کا مرکز مخالف کیمپ تھا۔ جب زبان والوں سے بیگانگی بڑھی تو پھر اردو ادب سے یگانگی کیا معنی رکھتی تھی۔

مولانا جیسی گرانمایہ ہستی کا یوں غیروں کے حصہ میں آجانا ان کی ملت کے لئے بڑا ہی صبر آزما تھا۔ ان جیسا سحر بیان اردو زبان کو آئندہ نصیب ہو کہ نہ ہو لیکن حسرت سے ہاتھ ملنے کے سوا ہمارے پاس چارۂ کار بھی کیا تھا ؎

سر شک گرم کی حدّت سے پوچھو
میرے دامن سے اپنی آستیں سے

لیکن مولانا غم روزگار کے اٹھانے کے کچھ اس طرح سے خوگر ہو گئے تھے کہ جدائی

کے اس مرحلہ کو بھی آسانی سے جھیل گئے۔ خود انھیں کے بقول "وقت جب گزرنے پر آتا ہے تو گذر ہی جاتا ہے"۔ قرائن بتا رہے تھے کہ ان کا دماغ ضرور اپنی جگہ سے ہل گیا تھا چنانچہ آخری کتاب "جد و جہد آزادی" ان کی ذہنی ناآسودگی کی غماز ہے۔ گل افشانیٔ گفتار کے لئے ویسا ہی سننے والا بھی تو ہو۔ اپنوں سے بچھڑ کر غیر کا ہو جانا انھیں راس نہیں آیا۔ دنیوی منصب و جاہ کے سارے لوازم مہیا ہونے کے باوصف قلب و روح کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ تا آنکہ ایک روز موت نے اس طوطیٔ ہزار داستان کے منہ پر مہرِ سکوت ثبت کر دی۔

Taj Tahir Foundation

مولانا رقم کرتے ہیں تو اس کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ قلعہ احمد نگر کا اداس اور ویران ماحول منظر کو مزید سوگوار بنانے کے لئے اس کے احاطہ میں ایک شکستہ سی قبر۔ لیکن انھیں کے الفاظ میں "زمانہ کے سابہ سرد جربے ان کی افتاد طبع کے سامنے بیکار ہی تھے"۔ اور سرگشتۂ خمارِ رسوم کی ہر ایک قید سے مبرّا۔ مولانا محبوس زنداں ہیں۔ سال پر سال اس عالم میں بیتتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن نظر کی فطری وسعتوں نے معاملہ حیات کے ہر ایک پہلو کو ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے وہ اسے فرصتِ چند روزہ سے تعبیر کر کے بسا غنیمت جانتے ہیں۔

مولانا دحدتِ سیاسی کے ہمیشہ منادر رہے۔ جداگانہ نظریۂ قومیت کی ہر ایک دلیل ان کے لئے بیکار تھی۔ تقسیم کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا کہ ابتدا ہی سے اندیشہ تھا مولانا، اہل وطن کے دوش بدوش کھڑے تھے اور آزادی کے بعد ان کی سرگرمیوں کا مرکز مخالف کیمپ تھا۔ جب زبان والوں سے بیگانگی بڑھی تو پھر اردو ادب سے بیگانگی کیا معنی رکھتی تھی۔

مولانا جیسی گرانمایہ ہستی کا یوں غیروں کے حصہ میں آجانا ان کی ملت کے لئے بڑا ہی صبر آزما تھا۔ ان جیسا سحر بیان اردو زبان کو آئندہ نصیب ہو کہ نہ ہو لیکن حسرت سے ہاتھ ملنے کے سوا ہمارے پاس چارۂ کار بھی کیا تھا ؎

سرشکِ گرم کی حدّت سے پوچھو
میرے دامن سے اپنی آستیں سے

لیکن مولانا غم روزگار کے اٹھانے کے کچھ اس طرح سے خوگر ہو گئے تھے کہ جدائی

کے اس مرحلہ کو بھی آسانی سے جھیل گئے۔ خود انھیں کے بقول "وقت جب گزرنے پر آتا ہے تو گذر ہی جاتا ہے"۔ قرائن بتا رہے تھے کہ ان کا دماغ ضرور اپنی جگہ سے ہل گیا تھا چنانچہ آخری کتاب "جدوجہد آزادی" ان کی ذہنی ناآسودگی کی غماز ہے۔ گل افشانیٔ گفتار کے لئے ویسا ہی سننے والا بھی تو ہو۔ اپنوں سے بچھڑ کر غیر کا ہو جانا انھیں راس نہیں آیا۔ دنیوی منصب وجاہ کے سارے لوازم مہیا ہونے کے باوصف قلب و روح کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ تا آنکہ ایک روز موت نے اس طوطیٔ ہزار داستان کے منہ پر مہرِ سکوت ثبت کر دی۔

Taj Tahir Foundation

باب پانزدہم ۱۵

علامہ اقبال

کہتے ہیں فطرت سب سے بڑی نبّاض ہے دنیا کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا کہ کسی فرعون کے ساتھ موسیٰ کو نہ پیدا کیا گیا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے عصا کو جوہری توانائی بخشی تاکہ وہ وقت کی ان طاغوتی قوتوں کو کچل سکے۔ جو ابن آدم کو اپنے گھیرے میں لینے کے لئے بڑھتی رہتی ہیں۔ علامہ اقبال اس وقت زینت گہہ عالم ہوتے ہیں جبکہ زمانہ شدت کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ لاتعداد مسائل زندگی ایک صاحب بصیرت مرد حق پرست کے ناخنِ ہوش کی توجہ کے لئے الجھے پڑے تھے۔ ان کی سیماب صفت طبیعت میں جذبۂ ابراہیمی، تاب و تب کلیمی۔ جرأت فاروقی کا بدرجۂ اتم ہونا اس امر کے غمّاز تھے کہ ایک خاص مشن کی تکمیل کے لئے وہ قدرت کے فرستادہ ہیں۔ روسو کہتا ہے کہ:۔

"ہم تعلیم تین ذرائع سے حاصل کرتے ہیں، فطرت انسان اور اشیاء جب یہ تینوں طریقے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو انسان اپنے صحیح نصب العین کو جان لیتا ہے"

غور کیجئے تو ہماری ساری تگ وتاز اسی ایک محور پر ہوتی ہے۔ کبھی ہم مجسم سوز بن جاتے ہیں اور کبھی ساز دلوں کے آتشکدوں کو گرمانے کے لئے مرد کامل کا صرف ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

تاریخ کا ایک نیا باب اقبال سے شروع ہو رہا ہے۔ حالی کے ناولوں اور اکبر کے فکر میں ڈوبے ہوئے طنز و مزاح کے تیر اپنا کام ختم کر چکے ہیں عظمت کی یادوں کے مزار پر بیٹھ کر آنسو بہانے کا وقت گزر چکا ہے۔ ہند اور کہر میں لپٹے ہوئے ماضی کے پیچھے افق کے اس پار صبح کا روشن ستارہ آمد فصل بہار کی نوید لایا۔ شاعر کی آواز کی بازگشت فضاؤں میں پھول بکھیر رہی ہے ہراس و ناامیدی کا حصار تنگ۔ کائنات کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو گیا۔ طاغوتی قوتیں لرزہ براندام ہوئی جاتی ہیں۔ نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ ایک قوم منصۂ شہود پر ابھر رہی ہے۔ ان سارے سلب شدہ حقوق کی واگذاشت کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لے لی۔ جو پوری دنیا کا مشترکہ سرمایہ ہیں کسی ایک قوم کا نہیں۔ فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

تمام رات تو ہنگامہ گستری میں کٹی
سحر کا وقت ہے اللہ کا نام لے ساقی

Tahir Foundation

لیکن اس کے لئے بس ایک شرط ہے کہ ثبت نصب العین سامنے ہو۔ شمع فانوس میں ہو یا اس کے باہر، پروانہ کو جل جانے کی دعوت دینے کے لئے صرف اس کی روشنی کافی ہے۔ آخر شب جب وہ گل ہونے کے قریب ہوتی ہے تو اس کا سارا جوش و خروش سرد پڑ جاتا ہے گویا جان دینا اس کی معراج تھی۔ جب یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ سر دینے کا موقعہ نکلتے ہی وہ اس طرح بے دم ہو کر گر جائے گی جیسے اب کوئی چیز اس کے پاس باقی نہیں رہی ہو۔ گویا۔ ع

دیوانگی کے جوش سے سر ہے وبال دوش

علامہ اقبال کے متعلق ایک عرصہ سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ وہ پہلے فلسفی تھے یا پہلے شاعر۔ لیکن اگر ہم ان کی شخصیت سے ان ہر دو افادی پہلوؤں کو علیحدہ کر کے دیکھیں تو مناسب ہوگا۔ لاریب مقام آدمیت ہر ایک چیز سے بالاتر ہے۔ ہم کسی زاویہ نظر سے جانچیں اور پرکھیں۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے زد آتا ہے۔ اس کی اضافی قدریں بعد کو دنیا کے بہترین دماغوں نے نسل انسانی کے لئے جو ضابطۂ حیات مدوّن کیا ہے اس میں پورا زور قلم اس امر پر صرف کیا ہے کہ وہ اپنی ذات کو مکمل بنانے کی سب سے پہلے کوشش کرے لیکن یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی اسی لئے ہر ایک دور میں کاملیت کی جانب بڑھنے والوں کی تعداد معدودے چند ہی رہی ہے کسی کی ہمت پہلی ہی جست میں جواب دے گئی۔ کوئی دو چار منزل طے کر پایا تھا کہ جی چھوڑ بیٹھا۔ ع

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

شاعرِ مشرق اس دور کے پہلے انسان تھے جو راہ کی صد ہزار صعوبتیں اٹھا کر اس مقام پہ پہنچے جو قدرت نے ان کے لئے مختص کیا تھا۔ ان کی رفتار و گفتار پہ وہی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ان کے قلم اور دماغ سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ خواہ وہ اشعار کی صورت میں ہو یا نثر کی۔ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے انھیں قدرت نے جو چشم بینا عطا کی ہوش و آگہی کی نعمت عظمیٰ میں سے جو حصہ وافر ان کو ملا ان کا قلب و دماغ جن کیفیات سے دوچار ہے وہ سارے تاثرات سمٹ کر کلام و بیان میں سمو گئے تھے کہتے ہیں کہ ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ طے ہو

دل کی یہ ہی آرزو تو ہے جو تلاش و جستجو کی حس کو بیدار رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر، جذب و سرور

ان کی خود سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اشعار میں سحر سامری جیسا انداز کہاں سے آیا لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا اسی لئے میرا کوئی رقیب نہیں وقت آگیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرز حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصلی مقصد کیا تھا۔"

Taj Tahir Foundation

کہتے ہیں کہ ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجکو حدیث رندانہ

اقبال کی شاعری میں خودی کا نظریہ جانِ سخن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا بیان انھیں کی زبان سے سنئے ؎

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

مردانِ حق پرست جب اس راہ پر قدم رکھتے ہیں تو نہ کانٹوں کی فکر کرتے ہیں اور نہ اپنے آبلۂ پا کی جانب دیکھتے ہیں، جب خوف و ہراس نے دامن کھینچ کر آگے بڑھنے سے روکا جب خودی کی موت واقع ہو گئی کہتے ہیں ؎

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ - یا جذبِ کلیمانہ
بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ :-

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ پادشاہی

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

عارف کا کام حصولِ مقصد میں اپنے آپ کو کھو دینا ہے پا جانا نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

جنوں کی حشر سامانیوں کی تمنا کرنا صرف انھیں کو زیب دیتا ہے کسی دوسرے کو نہیں۔ ع

نگاہِ لطف جسے آشنائے راز کرے

ان کی شاعری کے دو رخ ہیں ایک اسلامی دوسرا وطنی۔ اوّل الذکر رنگ، آخر الذکر پر غالب ہے۔ وہ ہندی نژاد ہیں تو ہوا کریں۔ اصلی تعلّقِ خاطر تو خاکِ یثرب سے ہے کہتے ہیں کہ۔ ع

نغمہ ہندی ہے تو کیا نے تو حجازی ہے میری

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

خدا سے دست بدعا ہیں کہ ؎

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان غلامی پر قانع نہ رہیں اور ملک کی آزادی کی جد و جہد میں جی کھول کر حصّہ لیں۔

بصر وہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ بینا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اقبال کو یہ بات دکھ پہنچاتی ہے کہ مسلمانوں میں جوشِ جہاد کا جذبہ سرد پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

زندگی کے آخری دور میں وہ دوسروں کو دعوتِ ابراہیمی دیتے دیتے خود بھی آگ نمرود سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدانِ سیاست میں داخل ہو گئے۔ لیکن ایک کامیاب سیاست داں بننے

کے لئے جس قسم کے حربوں کی ضرورت تھی وہ ان کے مسلک و مشرب کے خلاف تھا۔ انھیں میدان سیاست سے کیا واسطہ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

ایک مقبول بارگاہ ہستی ہی اس نوازش ہائے بے پایاں کی مستحق ہو سکتی ہے۔ کوئی اور نہیں ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

کاش وہ اپنی جگر کاویوں۔ نالہ ہائے نیم شبی اور دعائے سحری کا نتیجہ قیام پاکستان کی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ واحسرتا۔ خیال ہوتا ہے کہ شاعر کے متاعِ وجود کو مٹانے میں موت نے کون سے حربے استعمال کئے ہوں گے کس رخ سے اس مجسّم ہوش و آگہی پر اپنی خونی کمند ڈالی ہو گی۔ ان کی موت ایک شاعر اور فلسفی کی موت نہیں پوری انسانیت کی موت ہے اس کی آنکھیں بے نور ہوئی جاتی ہیں۔ اس کے درمیان سے وہ دیدہ ور چلا جاتا ہے۔ جس کی چشم بینا "تا زیست" انسانی درد اور دکھ پر خون کے آنسو روتی رہی۔ مادر گیتی کا کلیجہ شق ہوا جاتا ہے اس کی عزت، اس کی آبرو افلاک کی وسعتوں میں گم ہو جانے کے لئے اسے چھوڑ رہی ہے۔ آہ اب اس کے جانے کے بعد یہ پوزا گرہ ارض اندھیری رات میں تبدیل ہو جائے گا۔ وطن میں بہاریں آئیں گی۔ در و دیوار پر سبزہ اُگے گا۔ اشجار نیا لباس پہنیں گے۔ مرغزاروں کی چمن

بندی ہوگی۔ شگوفے کھلیں گے۔ بھیگی ہوئی رنگین فضائیں ہوش و خرد پر سچلیاں گرائیں گی۔ ہر ایک نیا دن سرور و انبساط کا پیغام لائے گا۔ زندگی عبارت ہوگی مسرت و شاد کامی سے لیکن کون جانے ان جیسے ایک اور دانائے راز کی پیدائش کے لئے کس قدر صدیاں درکار ہوں گی ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

Taj Tahir Foundation

باب ہفدہم ۱۶

سید طفیل احمد منگلوری

دنیا کے ہر دور میں تجربہ نے مُعلّمی کے فرائض انجام دئے ہیں۔ ہمارے خیالات کی ساری تخم ریزی اسی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ الفاظ کا قالب انھیں ایک منظّم صورت میں تبدیل کر کے اُن ادب پاروں کی تدوین کرتا ہے۔ جو انسانیت کی تکمیل میں اساس کا کام دیتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی تعداد خال خال ہے جو اس روشنی سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ تجربہ وقتاً فوقتاً انھیں مواقع مہیا کرتا رہتا ہے۔ لیکن صرف چند افراد اس نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور وہی اپنے دور کا عنوان سمجھے جاتے ہیں۔ وہ قوم کا دماغ اور جوہری توانائی ہیں۔ دُھند اور کُہر میں لپٹے ہوئے اس خرابے میں کراہتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کے لئے ایسے لوگوں کا وجود منارۂ روشنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا سید طفیل احمد کا شمار انھیں مذکورہ بالا اصحاب انسانیت اصحاب میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی قومی اور ملّی سرگرمیوں

کا آغاز آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کیا۔ مولوی بشیر الدین مرحوم بانی اٹاوہ کالج لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے مولانا کو پہلی بار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۰ء میں دیکھا جبکہ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کی دوکان میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ مفید جماعت طلباء کی امداد کے لئے اسی سال قائم ہوئی تھی"۔

وہ کافی طویل عرصہ تک کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری اور نائب صدر رہے۔ دس سال تک رسالہ "سود مند" ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس پرچہ میں مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی پر نہ صرف مفید مضامین شائع ہوتے تھے بلکہ مستعد تجاویز بھی پیش کی جاتی تھیں تاکہ وہ ان پر عمل درآمد کر کے اپنی حالت کو بہتر بنائیں۔ ایک خاص بات مولانا کی تحریروں میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ پڑھتے سوچتے اور ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں اس کو بغیر شاعرانہ تعلی کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں حقیقت نگاری تحریر کا اصلی حسن ہے۔ پروفیسر بلنٹ کی رائے میں

"ادب کا مقصد اظہار نیابت اور ابلاغ ہے"۔

علی گڈھ تحریک کو سمجھنے کے لئے ان کی مشہور کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کا وہ حصہ جو تاریخی اور تعلیمی پس منظر سے متعلق ہے کافی مدد دیتا ہے۔ وہ جس موضوع کو لیتے ہیں۔ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ معاملہ کے ہر ایک جزوی مسئلہ پر

اس قدر سیر حاصل بحث کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن نشین ہو کر رہ جاتا ہے۔
ان کے سیاسی مطمح نظر سے ہمیں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے خلوص پر شبہ
نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عملی زندگی انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ "یوسف مستقبل"
میں مسلمانوں کی ۷۵ سالہ تعلیمی اور سیاسی جد و جہد کی کامیاب تصویر کشی
کی گئی ہے۔ ہر ایک تصنیف میں اس کے مصنف کی شخصیت پورے طور پر
جلوہ گر ہوتی ہے۔ مولانا نے مسلسل نصف صدی تک اُردو زبان کو جو سنجیدہ اور
فکری ادب دیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنی میں ایک مصلح اور ریفارمر
تھے۔ علیگڑھ کا دوسرا ادبی دور اُن پر ختم ہو گیا۔ وہ اس ہراول دستہ کے
آخری آزمودہ کار سپاہی تھے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

Taj Tahir Foundation

باب ہفتم

ترقی پسند ادب

۱۹۳۱ء کا زمانہ ہے اور ملک تاریخ کے فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکا ہے۔ برطانوی استعمار کے خلاف بغاوت کے شعلے اُٹھ اُٹھ کر آسمان کو چھو رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو سال کی عظیم قربانیوں کا مثبت پہلو طویل انتظار کے بعد سامنے آیا ہے۔ مادرِ وطن کے حسین چہرہ سے غلامی کا سیاہ داغ اپنے سرخ لہو سے مٹانے کے لئے اس کے سپوت جوق جوق آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کی بے چارگی اور لاچاری ہماری قومی حمیت کو ایک عرصہ سے چیلنج دے رہی تھی۔ لیکن اب ہمارا ضمیر بیدار ہو چکا تھا اور ہم اس کی پاؤں کی بیڑیاں اور ہاتھوں کی زنجیریں کاٹنے کے لئے ہر ایک طاغوتی قوت کو للکارتے ہوئے میدانِ رزم میں آ گئے ہیں۔ ہمارے ناقابلِ تسخیر عزم نے دشمن کی صفوں میں ہل چل ڈال دی ہے۔ سیاسی محاذ کی اس گہما گہمی میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا اہم حصہ رہا۔ انھوں نے اپنے قلم سے لاتعداد جانباز پیدا کئے۔ اس مرحلۂ خاص پر ۱۹۳۳ء میں کچھ نوجوانوں کے ہاتھوں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا قیام

ملک کے لئے فالِ نیک تھا۔ ان کے اس اقدام پر بالعموم طمانیت کا اظہار کیا گیا۔ ادیبوں اور صحافیوں کی کثیر تعداد کے جیل جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا توقع تھی کہ یہ لوگ اس کمی کو پورا کر دیں گے سیاسی تحریک میں ادب کی ہم آہنگی ضروری چیز ہے۔

سیاست داں اور ادیب دونوں مل کر عصری تقاضوں کے لئے کام کرتے ہیں۔ انجمن کے بانی فیسٹو پر منشی پریم چند اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے دستخط کر کے اُسے اہمیت کی سند دے دی تھی۔ لیکن ان بزرگوں نے ساتھ ہی یہ بھی نصیحت کی کہ "اُس ادب کی تخلیق کے لئے محنت کی جائے جو صحیح اور ضروری ہو۔"[1]

لیکن اس وقیع ادبی کام کا آغاز "انگارے" جیسی کتاب کی اشاعت سے ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں ترقی پسندوں کی یہ پہلی ادبی پیشکش تھی۔ پروفیسر احمد علی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمیں یہ خیال ضرور تھا کہ مخالفت ہو گی لیکن اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر شدت اختیار کرے گی کہ ملک بھر میں تہلکہ مچ جائے گا۔"[2]

"انگارہ" میں ترقی پسندوں کے واضح رجحانات دیکھ کر ادبی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ مستقبلِ قریب میں نوجوان ادیبوں سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہ آئیں۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن مذکور کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت

---

[1] روشنائی ص ۲۶ سجاد ظہیر

[2] ص سیپ کراچی ص ۲۴۲

میں منعقد ہوا۔ ان کے خطبہ کا لب و لہجہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ انجمن کی ادبی سرگرمیوں سے غیر مطمئن اور مشکوک سے ہیں مثلاً انھوں نے کہا کہ۔

"جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہوتا ہو۔ روحانی تسکین مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد پھر کہا کہ ہے۔

"ہمیں ایسا ادب چاہئے جو سلائے نہیں کیوں کہ اب سونا موت کی علامت ہے۔"

کانفرنس کے سہ روزہ اجلاس میں جس قدر مقالے پڑھے گئے تھے سب کا انداز مفکرانہ سے زیادہ جارحانہ تھا۔ انجمن کے بانی اور سرگرم کارکن پروفیسر احمد علی صاحب نے اپنا جو مقالہ پڑھا اس میں اقبال اور ٹیگور کو رجعت پسند قرار دیا۔[1]

سجاد ظہیر صاحب لکھتے ہیں کہ ہے۔

"سر رضا علی صاحب کی تقریر سن کر میں نے محسوس کیا کہ مرحوم اردو ادب کے معاملہ میں حالی۔ اکبر اور اقبال سے آگے نہیں بڑھے ہیں انھوں نے مزاحیہ انداز میں ترقی پسند ادب پر چوٹیں کیں۔ اس کے بعد خواجہ محمد شفیع صاحب نے زبان کی غلطیاں بتائیں ان کے تصورات کو مخرب اخلاق

---

[1] روشنائی ص ۱۰۹

پست اور غیر شاعرانہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔[1]

۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب نے "ادب اور زندگی" کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں مبسوط اور مدلّل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی اور پرانے ادب کی رجعت پرست قدروں کی تشریح کر کے اس کی سخت مذمت کی۔[2]

بار بار اعلان کیا جاتا کہ ہماری ترقی پسندی اس امر کی متقاضی ہے کہ ہم کھوٹے اور کھرے کی پرکھ کریں نیز یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ہم پرانی فکر کے سوچنے کے انداز کو انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر خارج کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر سجاد ظہیر صاحب کہتے ہیں کہ :-

"جدید اردو ہندی نثر اور نظم انھیں اصلاح اور تعلیمی تحریکوں سے متاثر تھی۔ حالی کا مسدس سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں کی تہذیب اخلاق کے مضامین آزاد کی نیچرل شاعری شرر گپت کی بھارت بھارتی ان میں ایک ہی قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔"[3]

---

[1] یہ جلسہ دہلی کے میونسپل کارپوریشن میں ہوا۔ روشنائی ص ۳۴۵

[2] روشنائی ص ۱۶۰

[3] روشنائی ص ۴۲

ملک کے طول و عرض میں انجمن کی شاخیں قائم کی جارہی تھیں۔ ادب کے اکھاڑے میں اترتے ہی ادیب کا پہلا کام یہ ہوتا کہ روایتی ادیبوں سے دست و گریباں ہو اور ان کی علمیت سے مرعوب ہونا چھوڑ دے کیوں کہ یہ ہی چیز ان کو مستقل طور پر احساس کمتری میں مبتلا رکھتی تھی ادب کم پیدا کرتے ادبی مسائل زیادہ سے زیادہ اُٹھاتے۔ مذہب، کلچر۔ قومی خصوصیات، رجعت پسندوں کے دل لبھانے والے جملے تھے، جن کا مذاق اپنی تحریروں میں اُڑانا بہترین تخلیقی کارنامہ قرار دیا۔ زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی عبارت ہے۔ انسانوں کے جسمانی، اخلاقی اور روحانی نشو و نما سے ہزاروں سال سے ساری دنیا کے ادب کی قدریں اسی ایک محور کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ا۔ زرا پاؤنڈ کہتا ہے کہ:۔

"ادب معاشرہ کا مقیاس الحرارت ہے"

قدیم اور جدید کا سوال اُٹھائے بغیر ساری ادبی کاوشوں کو جانچنے اور پرکھنے میں اسی ایک کلیہ سے کام لیا جاتا ہے۔ انجمن کی ابتداء کار سے یہ کوشش رہی کہ ادب کی ماہیت کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ خود کار مشین کی طرح تخریبی لائنوں پر دوڑتا رہے۔ مجتبیٰ حسین صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ادب میں نظریہ کی رٹ زندگی کو سستے طور پر
قبول کرنے کی وجہ سے ہے اس لئے نظریہ والا ادب
بے روح ہوتا ہے۔ اس میں سہل پسندی ہوتی ہے"[1]

ہر عہد ایک مزاجی کیفیت رکھتا ہے اس کی اچھی یا بُری خصوصیات ادب میں پورے

---

[1] ادب و آگہی ص ۵۲

طور پر ہموئی ہوتی ہیں لیکن زندگی کے کچھ مثبت اصول اور ضابطے ایسے ہیں جو فطرت کے فیصلوں کی طرح اٹل ہیں۔ ان سے انحراف کرنا کبھی مستحسن نہیں سمجھا گیا ہے۔ مثلاً صداقت کو لیجئے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر نوع انسانی کو چلنا ازبس ضروری ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اس سے بھٹک جاتا ہے تو یہ چیز اس کی شخصیت کو کامل بنانے میں بہرصورت حارج ہوتی ہے۔ انسانیت کی ساری اساس چند نظریات اور کلیات پر ہے۔ ہر ایک رائج الوقت سکہ کھرا نہیں ہوتا۔ ادب میں جامد نظریہ کا مسئلہ جو ہمارے ترقی پسندوں نے اٹھایا۔ اور جس کے خلاف مسلسل لکھا جا رہا ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور چالو رہے گا۔ پھر وہی ہم ہوں گے۔ اور قدرت کے بنائے ہوئے ضابطۂ حیات کی پابندیاں ترقی پسند ادیبوں نے اپنے مینی فیسٹو میں زور شور سے دعویٰ کیا کہ:۔

"ہماری انجمن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود کو ملک کی عام سامراج دشمن تحریک کا ایک حصہ سمجھتی ہے۔"

لیکن یہ وہ لفظ ہے جو ترقی پسندوں کے یہاں شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا۔ جدوجہد آزادی میں اگر ان میں سے کسی نے حصہ بھی لیا تو محض انفرادی طور پر پاکستان کا موقف جو ہمارے لئے موت اور زیست کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ یہ لوگ کھلے بندوں اپنی تحریر و تقریر میں اس کے خلاف لکھتے اور بولتے رہے۔ سجاد ظہیر صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"سید احمد خاں۔ حالی۔ نذیر احمد کی تہذیبی تحریک شمالی ہند کے مسلم زمینداروں، تاجروں۔ نوکری پیشہ

دانشوروں کی رجعت پسند ذہنیت کا اظہار کرتی ہے"۔

ان زعماء ملت پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا کہ انھوں نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دے کر جداگانہ سیاسی اور تعلیمی حقوق کا مطالبہ کیا اور دنیا کو باور کرایا کہ وہ زبان، کلچر اور ثقافت کے اعتبار سے دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ :-

"انگریز کے وفادار گروہ کی نمائندگی اس وقت مسلم لیگ کرتی تھی جس کی تشکیل سرسید کے جانشینوں محسن الملک۔ وقار الملک نے ۱۹۰۶ء میں کی تھی"[1]

ن م راشد صاحب نے حالی پر منجملہ اور باتوں کے یہ بھی اعتراض کیا کہ :-

"ان کے پاس اخلاقی قدروں کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی اور معیار نہیں تھا"

"۱۹۳۶ء مسلم لیگ کی تحریک کے بڑے زور کا زمانہ تھا۔ یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ اس مدت میں فرقہ پرستوں نے کسی قسم کا وقیع ادب نہیں پیدا کیا۔ رجعت پسندی بانجھ ہوتی ہے۔ اس کی کوکھ سے فن اور ادب کی تخلیق نہیں بلکہ تخریب ہوتی ہے"۔

اس کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"ان دنوں زندہ رہنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں

---

[1] روشنائی۔

ایک نئی صبح پھوٹ رہی تھی۔ دل و دماغ پر سے اندھیرے
کی سلیں جیسے کسی نے آہستہ سے کھسکا دی ہوں۔ ہماری
نوجوان۔ رگوں میں ایک انبساط کی سی کیفیت طاری تھی۔
انقلابی تحریکوں۔ بلند عزائم اور جھلملاتی ہوئی امیدوں کا
زمانہ تھا۔[1]

کیا ظہیر صاحب جانتے ہیں کہ یہ

رنگا رنگ موسم جس میں زندہ رہنا بھلا لگتا ہے، اس کے کٹے دھرے کے نتیجہ
میں آیا وہ کون منچلے لوگ تھے جن کی قلمی کاوشوں نے جذبات میں وہ تیزی اور گرماگرمی
پیدا کی کہ آگ اور خون سے ہولی کھیلنا ایک معمولی سی بات سمجھا جانے لگا۔ اور جنھوں نے
بیم و رجا کے ہر ایک وسوسہ کو ٹھکرا کر ہاتھ پیش قبض پر رکھ دیئے۔ توپ کے دہانوں پر
بیٹھ کر بغاوت کی باتیں کیں اور لکھیں۔ حالی اور شبلی کے عہد کے پرآشوب ماحول کو پلٹ کر
چشم تصور سے دیکھئے نقل و حرکت چپہ چپہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ لب ہلاتے ہی ہونٹ
سی دینے کا حکم ہے۔ انگریز کی مذمت میں قلم پکڑنے پہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں
ڈالنے کی رسم عام ہے۔ مولانا حالی مسدس نہ لکھتے تو اپنی حالت بیچارگی کو بدلنے کا
احساس یہ شدت اختیار نہ کرتا اور یہ بہار یہ موسم کیسے آتا جب کہ عوام کارواں در کارواں
انقلاب کے پرچم ہاتھوں میں اٹھائے اپنی عظمتِ رفتہ کو ہر قیمت پر واپس لینے کے
لئے اٹھ کھڑے ہو گئے تھے۔ انتظار حسین صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] روشنائی۔

"انسانی اخلاق کے جو تین بڑے آہنگ ہیں آزادی
مساوات۔ محبت ان میں سے کوئی بھی آہنگ اپنے
بھرپور معنی میں حالی کی اخلاقی تعلیم میں
موجود نہیں ہے۔"

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں:۔

"جب ہم عشقیہ غزل کہنے والے حالی کا مقابلہ نظم
لکھنے والے حالی سے کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ
نثر کو موزوں کر رہے ہیں۔ ان کی تاریخی خدمات کا ذکر
کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن جیسا کہ ہمارا وطیرہ ہے ہم
اپنی تنقید سے چوکیں گے نہیں۔"[1]

اصنافِ ادب میں نظم ہو یا نثر دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ "اونگھتے ہوئے۔ معاشرہ کو جھنجھوڑنے میں اس نے کس قدر حصہ لیا۔ حالی کا تعلق عام متوسط طبقے سے تھا اس لئے ان کی بات وزن کے قابل نہیں۔ سرسید میں رؤسا کی سی آزاد خیالی اور تمکنت ہے۔ اس لئے وہ بھی درخور اعتنا نہیں رہے۔ شبلی تو زندگی بھر عرب اور عجم کی داستانیں اور قصیدے لکھتے رہے۔ رجعت پسندی اور روایت پرستی میں ہر ایک ترقی پسند ان کے نام کو زیبِ عنوان بنانا اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن "قدامت پرست شبلی" نے جو ضخیم سرمایہ اردو ادب میں چھوڑا۔ نصف صدی گذرنے کے قریب ہے لیکن اس کی اہمیت اور

---

[1] فنون لاہور جولائی ۱۹۶۵ء ص ۳۰

افادیت آج بھی اسی قدر خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ جیسی کہ اس کے تدوین کے وقت تھی۔ زمانہ کے ساتھ سوچنے کے انداز بدلے طرزِ گفتار بدلا لیکن شبلی کی شگفتگی۔ دقیقہ سنجی اور زور زبیان ادب میں ابھی تک ناپید ہے۔ ۱۹۳۶ء سے "انجمن ترقی پسند مصنفین" مسلسل ان پر لے دے کر رہی ہے لیکن ان کی بلند و بالا ادبی و علمی شخصیت ہنوز ان کے دسترس سے باہر ہے پاکستان کا قیام جس قسم کے حالات میں عمل میں آیا اور جس تنگ نظر ذہنیت نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ ایک علیحدہ آزاد ریاست قائم کر کے اپنے قومی وجود کو مٹنے سے بچائیں۔ گذشتہ اٹھارہ سال میں وہ سب کچھ بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے آچکا ہے۔ ترقی پسندوں نے جان بوجھ کر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے قدم قدم پر نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ۔

"۱۹۴۷ء کی تقسیم نے پنجاب کی وہ اگلی صحبتیں
درہم برہم کر دیں سامراجی شیطنت اور فرقہ پرستی کے
بھوت نے پنجاب اور دہلی کی سرزمین کو لہولہان کر کے
تہذیب و ادب کے چراغ بجھا دیے"[1]

بہر حال پاکستان ایک ٹھوس حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آگیا۔ اور ترقی پسندوں کی کافی تعداد اس نوزائیدہ ملک میں وارد ہو گئی۔ لیکن اس شرکینہ کا کیا علاج جو یہاں آکر بھی نہیں نکلا۔ اور زبان و بیان کا جو لب و لہجہ تقسیم سے قبل تھا وہی جوں کا توں باقی رہا۔ انقلاب اپنے پیچھے لاتعداد مسائل چھوڑ کر جاتا ہے۔ جمہوری دور کی ذمہ داریاں

---

[1] روشنائی ص ۳۵۸

معاذ اللہ گوش و ہوش کی ساری توانائیاں اس سے عہدہ برآ ہونے پر صرف کرنا پڑتی ہیں۔ آزادی کی دیوی اپنی قیمت وصول کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ غلامی کے ایام میں جسمانی صناعی ذہنی طاقت کا اس قدر بے دردی سے استحصال ہوتا ہے کہ سماجی گراوٹ کو بنانے میں جگ بیت جاتے ہیں۔ اور ہمیں تو جو مخصوص حالات ڈیڑھ سو سال تک اپنے گھیرے میں لئے رہے وہ مزید مشکلات کا باعث بن کر سامنے آئے تھے۔ لیکن ان لوگوں نے ایک روز بھی دل کھول کر قدرت کے اس بیش قیمت دینوی عطیہ کی قدر دانی نہ کی۔ عمرانی زندگی کے اس افادی پہلو پر جس کی حدیں مسلسل عمل اور تقاضے ملتی ہیں۔ خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ایک فلاحی ریاست کا قیام زندگی کے ہر شعبے میں بے پناہ حرکتی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ آقا اور غلام کی تفریق ختم ہوتے ہی عوام اور ریاست کے مفاد میں ٹکراؤ کی کیفیت باقی نہیں رہتی۔ فکر رسا کو نئے صحت مند خطوط پر کام کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ زندگی میں ایک قسم کا تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ ذہنی جمود جو غیر یقینی حالات کے دنوں کی پیداوار ہے۔ آزادی کی فضا میں اس طرح سے دور ہو جاتا ہے کہ اس کا معمولی سا بھی اثر دل و دماغ پر باقی نہیں رہتا۔ پہلی بار اندازہ ہوتا ہے کہ نے لیست سوز کے سوا ساز بھی ہے وہ ایک غنائیہ ہے ایک گیت ہے۔ آزادی جب آبادیوں کے لئے مسرت و شادمانی کا پیغام لاتی ہے۔ جب ہر ایک شخص کے دل میں نئی امنگیں کروٹیں لیتی ہیں۔ خوشگوار ماحول میں ادب کا حس و ادراک جاگ اٹھتا ہے اس کی قلمی کاوشوں کے لئے ایک مثبت نصب العین سامنے ہوتا ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ:-

"حزنیہ کا معمولی اثر بھی ہماری اسپرٹ کو ناکارہ کر دیتا ہے

اور ہمارے طور طریق پر عقل کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔"

غلامی کی سب سے زیادہ خرابی یہ ہی ہے کہ ہماری سرگرمیاں خواہ وہ اجتماعی ہوں یا انفرادی جزئیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ آزاد معاشرہ میں شاعر ادبی ثقافتی اور تعلیمی ادارے ریاست کے وجود کے استحکام کے لئے کام کرتے ہیں۔ اور امور خیر کا منبع ریاست ہوتی ہے۔ جے راس اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:۔

"ادیب اپنی ساری تخلیقات کے لئے ریاست کا
مرہونِ منت ہوتا ہے اور ادب کے پودے کو آزادی کی
فضا سازگار ہوتی ہے۔"

ایک مفکر لکھتا ہے کہ:۔

"اگر بعض افراد اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے
شر پھیلاتے ہیں تو یہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔ یہ ارتقا کی
ناسازگار صورتیں ہیں۔"

لیکن یہ کیسی بدقسمتی کی بات تھی کہ پاکستان کے قیام کو ایک جانگداز حادثہ قرار دیا گیا اور اس دن کو قیامت صغریٰ بتایا جس دن کہ اس نئی مملکت کا وجود عمل میں آیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں طرف کے ترقی پسند مصنفین نے اپنی قلمی کاوشوں سے حالات کو گویا بد سے بدتر بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ سجاد ظہیر صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"نئے حالات کی اس طرح سے تصویر پیش کی جائے
جس سے ہمارے سماج کے رستے ہوئے ناسوروں پر
انگلی رکھی جا سکے۔"

Taj Tamir Foundation

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں کہ :-

"احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۴۷ء کے فسادات اور اس کے بعد مہاجرین کی درگت جو ان کے لئے پہلے وطن میں نہیں تھی۔ اس موضوع پر متعدد افسانے لکھے"۔

انتظار حسین صاحب اپنے ایک مضمون "ہماری جڑیں کہاں ہیں" میں لکھتے رہیں کہ :-

"۱۹۴۷ء ہم اس لمحہ کو یاد کرتے ہیں جب ہم مہاجر تھے۔ مقامی بھی اور غیر مقامی بھی اس وقت پاکستان کا مطلب تھا ایک زمانہ[1] سے دوسرے زمانہ[2] میں ہجرت علی الاعلان کہتے۔ پاکستان کسی نصب العین کے تحت نہیں بنا ہے۔ بلکہ تاریخ نے ہمیں دھوکہ دیا ہے"۔

قرۃ العین صاحبہ کی نگارش ملاحظہ ہو۔ لکھتی ہیں کہ :-

"وہ بہت دکھ سے سوچتی ہیں کہ تقسیم نے ان کا بٹوہ کر دیا ہے۔ ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب[2] میں ہے"۔

---

[1] ادب لطیف جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۶۳ء

[2] "جلاوطن"۔

Taj Islamic Foundation

اسی گروہ کے ایک اور صاحب نے لکھا کہ :-

"کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی،
مسلمان ایسے مضحکہ خیز کردار کے قابل تھے"[1]

"اداس نسلوں" کے مصنف عبداللہ حسین نے پاکستان کے قیام کو تاریخ کا بڑا المیہ قرار دیا۔ لکھتے ہیں کہ :-

"ہمارے پاس نہ آئیڈل تھے نہ سیاست صرف بگڑی
ہوئی زندگیاں تھیں اور زہریلے دماغ جس کا
نتیجہ اس بگڑی ہوئی تاریخ میں ہوا۔ یہ وہ نسل ہے
جو پیدائش کے وقت سے اداس ہوتی ہے ہم ہندوستان
کی اس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں"[2]

ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"میں اپنے آپ کو ایسے صحرا میں محسوس کر رہا ہوں
جس کے چاروں طرف آگ کا دریا لہریں مار رہا ہو"

اسی گروہ کے ایک صاحب نے لکھا کہ :-

"زرینہ کے نچھاور کو جب پاکستان میں نئی زندگی کی
تعمیر کے لئے مدد نہیں ملی تو اس نے قادر پور پہنچ کر جام

---

[1] ادب لطیف جوبلی نمبر
[2] اداس نسلیں۔

Taj Tahir Foundation

شہادت نوش کر لیا۔ مگر اپنے تصوّرات سے غداری نہیں کی۔
اندرے ژید کی اس رائے کو مشعل راہ بنایا گیا۔ کہ "نیک
جذبات سے بڑا ادب پیدا ہوتا ہے"

طویل جد و جہد اور عظیم جانی و مالی نقصان کے نتیجہ میں زندگی نیا چولا بدلتی ہے۔ ایک خوشگوار تبدیلی کے آثار آہستہ آہستہ پیدا ہو رہے ہیں۔

اپنے بنیادی حقوق کے مطالبہ کے لئے اب دار و رسن پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس عالم میں بھی پوری قوم یاس و نا اُمیدی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے اور زیست سے بیزار ہونے لگے اور سارے ماحول پہ افسردگی چھائی رہے تو وطن کی صبح بہاراں کا جشن کون منائے گا اور یہاں کی سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی فضائیں خوشیوں کا پیغام کسے دیں گی۔ دراصل لوگ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس قدر دل برداشتہ ہو گئے تھے کہ ترقی پسندوں کے حزنیہ کلام و بیان کو بے وقت کی راگنی سمجھتے رہے۔ چوں کہ ان کے ساتھ قومی و ملی سیاسی خدمات کا کوئی پس منظر نہیں تھا۔ لہذا بہت جلد ان کے سارے پیچ و خم کا بھرم نکل گیا۔ "کالا سورج" "میلی چادر" "لہو کے چراغ" "اداس نسلیں" "آگ کا دریا" کیا اس قسم کے لٹریچر سے تعمیر ملّی کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ کیا ایک عظیم تر معاشرہ کی تشکیل کا کام ایسا سہل ہے کہ وہ طنزیہ اور دوراز کار راہوں میں الجھی ہوئی تحریروں سے ہو جائے۔ ابتدائے کار ہی سے انجمن ترقی پسند مصنفین، پارٹی لائن پہ اپنی ادبی مہم کو چلاتی رہی۔ اسی آزمودہ حزنیہ سے پاکستان میں بھی کام لیا گیا۔ اور چھوٹے بڑے سب ادیب اور شاعر دنیائے ادب پر اس طرح سے چھا گئے کہ ایسا گمان گذرنے لگا کہ آئندہ ہمارے ملک میں

شاید کمنی دوسرے بکتۂ فکر کے لئے گنجائش نہ نکل سکے گی۔ اصناف ادب میں شاعری تنقید اور افسانہ کا انتخاب کیا گیا۔ مرکزی نقطہ ہائے نظر عورت اور شراب قرار پائے۔ بھوک اور روٹی کا ذکر محض ضمنی طور پر مارکیٹ میں اپنی ساکھ قائم کرنے کے لئے تھا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ دنیا کے پیٹ کی آگ بجھانے کی اور ذہنی تربیت کی اجارہ داری ترقی پسندوں نے لے رکھی ہے۔ ۱۹۳۶ء سے لے کر تا ایں دم روٹی کپڑے کی جو سہولتیں مل پائی ہیں وہ بزعم خود انھیں کا کارنامہ ہے: ان کی پارٹی میں شامل ہونے کی شرائط اس قدر آسان ہیں کہ ہر شخص اس کا رکن بن کر اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ روایت پرست ادیبوں سے چھپنے کی اس میں عادت نہ ہو۔ غالب ہوں یا اکبر۔ اقبال ہوں یا میر یا حالی۔ دوسرے یہ کہ جس سرزمین پر بیٹھے اور اس کو اپنا وطن بنائے ناخن ہوش سے ایسا منہدم کرنے کہ نہ رہے بانس نہ بجے یا نسری۔ عورت اور شراب اس کی سعیٔ پیہم سے جو جنس ارزاں بنی ہے اس سے خود بھی جی کھول کر حظ اٹھائے اور دوسروں کو بھی بہتی دریا میں ہاتھ دھونے کی ترغیب دے۔ تیسرے ادیب شہیر نیز شاعر بننے کے لئے کچھ زیادہ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ ایلیٹ پڑھ کر عظیم تنقید نگار۔ بودلیئر پڑھ کر اعلیٰ درجہ کا شاعر جنسیات و نفسیات کا ماہر بننے کے لئے فرائیڈ کو پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی شخصیت اور عمومیت پائی جاتی ہے"

یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے حرفِ غلط کی طرح سے مٹا دینا چاہتے ہیں[1]۔ ایک ترقی پسند ادیب جو قیام پاکستان کے بعد ہی سے بہ ہزار خرابیِ بسیارِ ادب کی گردن پر سوار ہیں اپنی ادبی معرکہ میوں پر یوں گوہر افشانی کرتے ہوئے سُنے گئے۔

"غم روزگار نے دو سال کے لئے ہاتھ روک لئے تھے۔ اب پھر یہ ریاضت کر رہا ہوں لیکن اس شغل میں اتنی جان کہاں سا ادب کا جو پہلو دیکھا اس پر محبت کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اس تکرار سے تنگ آ کر مطالعہ ترک کر دیا۔"

اسی برادری کے ایک دوسرے بزرگ نے تو کمال کر دیا۔ اپنے لکھنے کی غایت جو بیان کی وہ یہ تھی کہ :-

"جہاں زندگی میں اور گناہ کرتا ہوں اس میں لکھنا بھی ہے۔ ترقی پسندوں نے برائیوں کو سماج سے دور کرنے کے لئے عجیب و غریب طرزِ عمل ایجاد کیا ہے پہلے خود برے بنو، سارے اخلاقی قوانین مذہب و مشرب کے رچائے ہوئے ڈھونگ ہیں۔ شہر یار اور سرمایہ دار بزدل ہیں جو قاضیِ شہر کے ڈر سے سیاہ

---

[1] شعراء عصر کا کلام صفحہ ۱

لبادہ اوڑھ کر بند دریچوں کے پیچھے معصیت کے کام کرتے ہیں وہی ہم کھلے بندوں کرتے ہیں اور یہ ہماری سب سے بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت ہے۔ اپنی اور دوسروں کی لغزشوں۔ فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کو اس طرح سے قلم بند کر کے دکھاؤ کہ معاشرہ کا گھناؤنا پہلو اُجاگر ہو کر پورے طور پر سامنے آجائے۔ دوست اپنی مسخ شدہ تصویر دیکھ کر تاسف سے ہاتھ ملیں۔ دشمن آنکھیں چرائیں، محتاط لوگ دامن بچا کر نکل جانے میں عافیت دیکھیں۔"

ہماری نئی نسل پردہ سیمین کی ان زندہ تصویروں کو دیکھ کر ان کی تقلید کر کے خود کو اُن ہی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے تو پھر کیا تعجب کی بات ہے۔

ایک نوجوان ادیب نے اپنے اعلیٰ کردار کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

"شام سے اس وقت تک ہم مسلسل پیتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے اوپر سے تہذیب۔ اخلاق۔ مذہب اور رواداری کے سارے لبادے ایک ایک کر کے اتر گئے ہم اب بالکل سچے انسان تھے کھرے آدمی۔ میرا

لہ جائزہ کراچی جولائی ۱۹۶۳ء۔

جی چاہ رہا تھا کہ قمر کے پیروں پر گر کر معافی مانگ لوں
مگر اس کے پاس ایک نیا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔"

منٹو مرحوم نے جو ترقی پسند افسانہ نویسوں کے امام مانے جاتے ہیں عجیب بات کہی ہے کہ :۔

"ماں اور طوائف میں کوئی حد فاصل نہیں۔ عورت ماں بھی ہوتی ہے اور طوائف بھی اور یہ کشمکش اس کی نفسیات کا ایک اہم پہلو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خود اُس کو اُس کا شعور نہ ہو۔"

کالی شلوار۔ اور سوگندھی میں طوائف کو جو عورت کا دوسرا چھپا ہوا روپ ہے ہر رنگ سے اُچھال کر ادب کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں کہ :۔

"اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے۔ دعا کرو آج ہی رات دو تین آدمی بھیجے۔"

اصناف ادب میں ایک نئی قسم "رپورتاژ" کے نام سے اضافہ کی گئی ہے۔ یہ کہانی الف لیلوی رنگ میں اس شان سے لکھی جاتی ہے اکثر رسالہ کا پورا شمارہ اس کے طولانی حجم کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ ایک سب سے بڑی مشکل قاری کے لئے یہ ہوتی ہے کہ مضمون ختم ہو جاتا ہے پھر بھی حال نہیں کھلتا کہ اس کا خالق کیا کہنا چاہتا ہے۔ طویل اُلجھے ہوئے مکالمے اس ذہنی پراگندگی اور انتشار کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں وہ خود مبتلا ہوتا ہے۔ مجمل و قوع مبہم غیر مانوس الفاظ کی

بہتات دماغ کو سخت بوجھل بنا دیتی ہے۔ اس مصروف دنیا میں جب وقت کو منٹوں اور سکنڈوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ خدا جانے ان کو اس قدر فرصت کہاں سے میسر آجاتی ہے۔ "ریویو ز ناٹز" کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ سُنئے۔ مکتبہ جامعہ کراچی میں ایک صاحب نے ممتاز مفتی کا ضخیم ناول "علی پور کا ایلی" واپس کرتے ہوئے کہا کہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ منیجر صاحب بولے "اگر آپ مجھ کو یقین دلائیں کہ آپ یہ ناول شروع سے آخر تک پڑھ لیں گے تو میں یہ کتاب مفت دیدوں گا۔" "تب تو میں اسے بالکل نہیں خرید سکتا" یہ کہا اور چلے گئے۔"

اخبارات میں اطلاع چھپی تھی کہ پنجاب میں کسی کالج کے پرنسپل نے ترقی پسند ادیبوں کی ساری کتابوں کو اپنی لائبریری کے لئے ممنوع قرار دے دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ادب طلباء کی دماغی اور ذہنی ناآسودگی کا سبب بنتا ہے اور ان کے کردار کو غلط سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ ہر ایک قصہ اور کہانی کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ وہ ساری روایتی داستانیں جن کا سُننا اور پڑھنا آج کل مذاق سلیم پر بار ہوتا ہے۔ ہماری عدیم الفرصتی اس کے طولانی حجم کو سمیٹنے سے عاجز ہے۔ پھر بھی ان کا ایک مقصد ہوتا تھا اور انسانی نفسیات کا ہر ایک پہلو اس طرح سے سامنے آجاتا جیسے یہ واقعہ شنیدہ نہیں دیدہ ہے۔ لیکن ترقی پسند ادب کی یہ شق ان میں سے کسی ایک کیفیت کی بھی حامل نہیں۔ پھر بھی اصرار ہے کہ ہمیں ضرور پڑھو:۔

"آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ"

نثر کے علاوہ طویل نظمیں لکھنے کا رواج بھی زور پکڑتا جا رہا ہے۔ بے ردیف

اور قوافی بڑی اور چھوٹی بحروں میں لکھی جاتی ہیں۔ چند اشعار بہ عنوان "دہلیز" ملاحظہ ہوں:۔

"روپا اس نگری کی رانی تو نہیں
پر راج نگر کرتی ہے"

"یہ زبان کون سی ہے"۔

"سنگ دل فرش سے صدیوں کی مسافت کا گلہ کرتے ہیں"۔

"راز پوشیدہ ہے"۔

پاک و ہند کے سارے ترقی پسندوں کا اس پر اجماع ہے اخلاقی اور انسانی قدروں کے خلاف بہت لکھو۔ اور بھرپور وار کرو بشری فطرت کی سہل پسندی، ان کی تحریروں کی مقبولیت میں معاون ہے۔ گذشتہ اٹھارہ سال میں عورت اور شراب کے موضوع پر جس قدر لکھا گیا ہے شاید ہی کسی اور مسئلے پر اس قدر توجہ کی گئی ہو۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ایک مجمع رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
ایشیا سے بھاگ کر آیا ہوں میں

منیر نیازی صاحب ایک نوجوان ترقی پسند شاعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ رہ عاشقی میں جان وجی سے گذر جانے کے لئے یہ وقت موزوں ہوتا ہے۔ اسی لئے دیوانگی کا

لہ سالنامہ ادب لطیف ۱۹۶۳ء

بھوت اُن پر ہمہ وقت سوار رہتا ہے۔ دن کو لڑکوں کے خوف سے باہر نہیں نکلتے تاکہ :۔

"کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانہ کو

چونکہ نہ اخبار پڑھتے ہیں اور نہ ریڈیو سنتے ہیں اسی لئے رات ہی کوچہ گردی کے جو ادب و آداب ہیں ان سے نابلد محض ہیں۔ ناصح کی اس بات کو کان دھر کر نہیں سنتے کہ یہ حق عرصہ ہوا عاشقِ جانباز سے چھین کر لٹھ بند پولس والوں کو دیدیا گیا ہے رات کے سناٹے میں طلسمی رنگوں سے بھیگتے ہوئے پردوں میں جھانکتے پھرتے ہیں نظارۂ محبوب ہوا یا نہیں یہ بات تو وہ جانیں یا کراماً کاتبین۔ بہر حال ان کے شاعرانہ دماغ کی داد نہ دینا بڑی بد ذوقی ہے۔ سُنتے ہیں کہ نئی زمانہ آرٹ اور شاعری ایک ہی لفظ کے دو معنی ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

سامنے ہے ایک تماشائے بہارِ جانستاں
نیم وا ہونٹوں پہ سرخی کے بہت مدھم نشاں
ریشمی تکیہ میں پیوست اس کی رنگیں انگلیاں

اسی زمین میں ایک اور شاعر کو سُنئے :۔

میں تیرے گھر کے پاس پہنچ کر بھٹک گیا
سچ ہے کہ دیوانی جوانی جسے کہیئے
مجنوں بھی اس عمر میں زنجیر ہوا تھا

سارے ترقی پسند شاعر اس سرزمین کا نقشہ کچھ اس طرح کا بناتے ہیں جس میں ہم اور وہ سسک سسک کر جی رہے ہیں۔

بے کفن زمیں دور دور پھیلی ہوئی
انکار کے رات دن سے گذارتا ہوں
میرے لئے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں

کہتے ہیں کہ ننگا اور بھوکا رہنا ازل نے اس کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ یہی چیز قنوطیت پسندی کا باعث بنی ہے۔ لیکن اب سے صدیوں پہلے ہمارے ایک شاعر نے جو بدقسمتی سے یورپ کا باشندہ نہ تھا ایک عجیب و غریب خبر سنائی تھی کہ :-

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

ہم ایشیا کے روایت پرست لوگ بزرگوں کی باتوں کو گرہ میں باندھ لینے کے عادی ہیں اور یہ چیز ہماری قومی سیرت کا ایک جز بن چکی ہے۔ بغیر حال روزگار کے عورت اور شراب کا تصور کیا معنی رکھتا ہے فرائڈ کے ملک میں عورت کو جنس ارزاں کے طور پر خرید و فروخت کیا جا رہا ہے۔ ہم مشرقی لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہ محلوں میں رہیں یا جھونپڑیوں میں۔ فٹ پاتھ پر دیکھی جائیں یا گاؤں کی پگڈنڈیوں پر۔ ان کا وجود مقدس معبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرائڈ کی اس جرأت پر کہ جو بات اور اہل قلم مفکر کہتے ہوئے گھبراتے تھے وہ اس نے صاف صاف کہہ دی ہے۔ مشعلِ راہ بنا کر نہ کہنے کی باتیں برسرِ عام کہی جا رہی ہیں۔ اور اسی چیز کو اپنی اخلاقی بلندی کی معراج بتایا جاتا ہے، گھر اور کوٹھے کی حد فاصل کو مٹانے کی جب ساری کوششیں ناکام ہو چکیں اور۔ ان کے عورت کے متعلق نظریات پر کافی لے دے ہوئی تو یک طرفہ شاعری شروع کر دی گئی۔ اس معاملہ میں بھی تعلّی

کی انتہا تھی۔ بھوک کی بات شروع ہوئی تو قحط بنگال کی منظر کشی کر کے رکھ دی۔ روٹی کی... خاطر معصوم جوانیاں نیلام ہو رہی ہیں معلوم نہیں یہ نیک کام کس کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے؟۔ باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں سے کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ روزانہ اخبارات میں اغوا کے ساتھ لرزہ خیز قتل کرنے کی جو وارداتیں شائع ہوتی رہتی ہیں:

وہ صحیح ہیں یا غلط؟ حقیقت یہ ہے کہ وقت نے ہر شخص کے کان میں پھونک دیا ہے کہ اگر زندہ رہنا ہے تو سنبھل سنبھل کر قدم بڑھاؤ۔ یک طرفہ شاعری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

لکھ اپنی ڈائری میں کبھی میرا نام بھی
دن تھے کہ تیری کار کا نمبر بھی یاد تھا

یہ ہی ایک وہ جھروکہ جسے بند پا کر کئی مسکرائے

واردات قلبی کا یہ اظہار نئی جدت ہے۔ ہمارے قدیم شعراء نے عورت اور خمریات پر جو مضمون آفرینیاں کی ہیں اس میں وہ کبھی رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے جب تک عشق کی آگ دونوں طرف برابر نہ لگتی۔ بات ابجد سے آگے نہ بڑھتی۔ مسکرا کر جب ہی ہاتھ چھوڑے جاتے جب کسی کی نظریں بچھا کرتیں۔ اظہار تمنا کے لئے محبوب کا روبرو ہونا ضروری تھا مثلاً ایک پرانا شاعر کہتا ہے:۔

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہار تمنا برملا ہونے لگا
تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر یہ نام کس کا تھا

... ریاض خیرآبادی کا شعر ہے:-

وہ سامنے ہیں نظامِ حواس برہم ہے؟
یہ آدھی رات کو ان کا پیام آیا ہے
ہم آج آ نہیں سکتے اب انتظار نہ ہو

دلچسپ بات یہ کہ روایت پرستی سے بیزاری کے باوجود محبوب تک رسائی کے لئے وہی پرانا حربہ استعمال کرتا ہے جو میرؔ اور مومنؔ نے کئے تھے۔ اسی سنگلاخ زمین میں شعر کہتا ہے جو عرصہ ہوا اس کے خیال میں برگ و بار لانے کی قوت کھو چکی ہے وہی بام و در وہی سنگ آستاں۔ وہی منت درباں۔ وہی ساقی وہی جام و مینا۔ سوچنے کے انداز بدلے ماہیت نہیں بدلی۔ نظم و نثر کے یہی شہ پارے" ہیں جن پر تنقید کرنے کی کسی کو جرات نہیں کرنا چاہیئے۔

ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں"

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ:-

"معمّر ادیبوں کو یا کم سے کم جن ادیبوں کے
کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے ہیں نوجوان ادیبوں کے
نقطۂ نظر سے بدکنے کی عادت چھوڑ دینا چاہیئے۔ جب
معاشرہ مسلسل بدل رہا ہو تو نوجوانوں کو پرانے نقطہ
ہائے نظر میں طوفانی ترمیم و تنسیخ سے ہم کیسے
روک سکتے ہیں"

آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ چار ترقی پسند شاعر اور ادیبوں میں ایک کا

تنقید نگار ہونا ضروری ہے۔ تنقید کے لئے جو ضابطے یورپ میں مقرر ہیں ان کا اطلاق تمام دنیا کے ادب پر ہوتا ہے مثلاً پہلا اصول تنقید کا یہ ہے کہ:-

"لکھنے سے مصنف کی غایت کیا ہے نیز وہ معقول بھی ہے یا نہیں۔ مقصد کو سمجھوانے کی قدر کا اندازہ لگاؤ۔ پھر اس کی تکنیک کی جانچ کرو"[1]

ایک صاحبزادہ صاحب نے ۱۹۴۵ء سے لکھنا شروع کیا چند افسانے لکھے اس کے بعد تنقید پر کتاب لکھنا شروع کر دی۔ دو ایک سال بعد صف اوّل کے نقادوں میں شمار ہونے لگے۔ سب سے پہلے روائتی ادیب ان کے قلم کے کشتۂ ستم بنے۔ اس کے بعد تو کاٹ چھانٹ کا یہ عالم ہو گیا کہ کسی مکتبۂ فکر کا ادیب ان کی نیش زنی سے محفوظ نہیں رہا۔ سجاد ظہیر صاحب ترقی پسندوں کی اس روش خاص کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"سارے فنون لطیفہ میں ہمارے ادب نے شاعری، افسانہ نگاری۔ بالخصوص تنقیدی ادب میں اپنی بساط اور عمر سے زیادہ کام کیا ہے۔ روایتی ادیبوں کا پورا گروہ اس کی جسارت پر اس سے خفا ہے"

دنیا کے ہر ایک دور میں انسانیت کے اعلیٰ اصولوں کی ترویج و اشاعت کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینا ادیب کا اوّلین فریضہ ہے۔ اس لئے اس کی

---

[1] نقد ادب ص ۱۹۴

شخصیت میں اکثر خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ اس کی تحریریں جب لوگوں کے دلوں کو اپیل کرتی ہیں۔ جب انھیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی ذات ایثار اور خلوص کا مکمل نمونہ ہے۔ سالہا سال کے ریاض سے جو کچھ اس نے تجربات حاصل کئے ہیں۔ جو روشنی بغیر کسی رکاوٹ کے اس تک پہنچی ہے اس کا ابلاغ دوسروں تک کرتا ہے تاکہ وہ بلا کسی حجت کے اس کی کہی ہوئی بات پر ایمان لے آئیں اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب کہ خود اس کا کردار ہمہ جہت مکمل ہو۔

اور اس کی بات پر ایثار کی

چھاپ لگی ہو۔ مغرب کے ایک امام ادب پشکن نے فرانسیسی ادیبوں کو تنبیہ کی تھی کہ "وہ فسق و فجور کو دلچسپ چیز بنا کر پیش کرنے کی عادت چھوڑ دیں۔"

وہ جانتا تھا کہ دنیا کے ہر ایک معاشرے میں ادیب کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ایک لفظ کو سند سمجھا جاتا ہے۔ کیا فرماتے ہیں۔ ترقی پسند ہیج اس مسئلہ کے۔

"زید شراب کثرت سے پیتا تھا جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گیا یہاں فلموں میں کام نہ ہونے کی وجہ سے قلم کا سہارا لینا پڑا ادب جیسی بنجر زمین میں سے روزی پیدا کرنا اسی کا کام تھا ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ میں ہی اچھا لکھنے والا ہوں۔

[1] گنجینہ گوہر صـ ۱۵۲ شاہد احمد۔

جس ادیب کا کردار اس منزل میں ہو کہ پبلشر دور سے دیکھ کر ٹل جائیں کردہ... آرہا ہے۔ کیا اس کی تخلیقات ایک نئی اور ابھرتی ہوئی سماج کو ایک مثالی زندگی کے لئے تیار کر سکتی ہیں۔

مذکورۂ بالا ادیب کے بارہ میں شاہد احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ۔

"روٹی ملے یا نہ ملے بیس روپیہ روزانہ شراب کے لئے ملنے چاہئیں۔ اس کے لئے انھوں نے اچھا برا سب لکھ ڈالا، روزانہ دو ایک افسانے لکھنا معمول ہو گیا تھا۔"

ان کی برسی پر جو مجلس عزا برپا ہوتی ہے اس میں عورت اور شراب کے متعلق ان کے افکار عالیہ کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں تہذیب آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان جب اپنی سطح سے گرنے پر آتا ہے تو کہاں پہنچ کر دم لیتا ہے۔

گذشتہ سترہ سال میں علوم و فنون کے شعبہ میں جس قدر کام ہوا ہے وہ مایوس کن نہیں لاتعداد ادارے تصنیف و تالیف نیز غیر ملکی مفید کتابوں کے ترجم کر کے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ حکومت مختلف صورتوں میں ان کی مالی معاونت کر کے ہمت افزائی کرتی ہے۔ لیکن جہاں تخلیقی ادب کا تعلق ہے۔ اس کی رفتار انتہائی سست بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ افسانہ اور تنقید پر ادیبوں کی پوری جوہری توانائی صرف ہو رہی ہے۔ اصناف ادب کو چند موضوعات میں محدود کر دینا زبان کی ترقی کے لئے فال بد ہوتا ہے۔ ترقی پسندوں نے انجمن کے آغاز

میں کچھ فارمولے ایسے بنائے تھے کہ کوئی ایسی بات لکھو کہ ساری دنیا چونک پڑے۔ مثلاً اچانک یہ خبر سننے میں آئی کہ "ہمارے ادب میں انحطاط" آیا ہوا ہے۔

اڑتی سی ایک خبر تھی زبانِ ظہور کی

ادب میں یہ بحران کہاں سے آیا کدھر سے آیا، اور کون لایا، اس کی کوئی خبر نہیں نکلتی تھی لیکن ان دنوں سارے جرائد ادبی انحطاط کے موضوع پر پوا زورِ قلم صرف کرنے میں لگ پڑے تھے۔

حسن عسکری صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"جب کوئی سیاسی یا اخلاقی حادثہ ہوتا ہے تو میں بڑے رنج سے کہتا ہوں کہ کاش لوگ بودلیئر پڑھتے"۔

ان کے خیال میں ادب پر یہ بپتا اس لئے پڑی ہے کہ لوگوں نے بودلیئر کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس سانحہ کی ایک اور وجہ یہ بھی بیان کی گئی کہ لوگ میراں جی سے بدعقیدہ کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں ضرورت پڑتی ہے ان کا نام لے لیتے ہیں۔ سجاد ظہیر صاحب ایک مناظرہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"میں نے کہا کہ ایک عالم دین کے لئے ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے وقت میراں جی وغیرہ کو ان کا نمائندہ بنا کر پیش کرنا کہاں کی دیانتداری ہے[1]"۔

---

[1] روشنائی ص ۳۴۶

سنہ ۱۹۵۴ء میں اسی برادری کے ایک صاحب
کہہ رہے تھے۔ میراں جی کا تئیں ادب کی تحریک
پر بڑا احسان ہے وہ نہ ہوتے تو نئے ادیب اور
شاعر پیدا نہ ہوتے یہ ان کا بہت بڑا سہارا تھے۔"[1]

ادب پر یہ مصیبت یوں بھی آن پڑی تھی کہ لوگوں نے میلارمے اور بودلیئر کا نام وضو سے لینا چھوڑ دیا ہے۔ نیز یہ کہ آزاد ملک میں رہتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر مگن بیٹھے ہیں جیسے کرۂ ارض پر ہمارے سوا کوئی اور نہ رہتا ہو۔ ڈاکٹر اجمل صاحب نے لکھا کہ :-

"ہمارے ادب کا سب سے بڑا مسئلہ انحطاط کا ہے"۔

شبلی اور حالی کے نامون سے چھپنا ایک مستقل خواب آور احساس کمتری ہے کیوں نہ ہم دیوانِ حافظ سے فال نکالیں یا نماز استخارہ پڑھیں[1]۔

حسن عسکری صاحب نے تو غضب کر دیا لکھتے ہیں کہ :-

"سنہ ۱۹۴۷ء میں اردو کی نظم اور نثر دونوں بحیثیت مجموعی مر چکی تھیں۔ اقبال - پریم چند۔ حسرت موہانی۔ دو ایک ادیبوں کی موجودگی پورے ادب کی زندگی کا ثبوت نہیں ہو سکتی"[2]

---

[1] ستارہ یا بادبان ص ۱۱۴ ص ۱۱۵

[2] ادب لطیف سالنامہ سنہ ۱۹۶۳ء۔

قرۃ العین حیدر اپنے مضمون "کیا ادب رو بہ تنزل ہے" میں لکھتی ہیں کہ انھوں نے ایک معصوم بچی کو مشورہ دیا کہ کرشن چندر پڑھو۔ کیوں کہ کوئی نیا اور پرانا مسلمان ادیب ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ درآنحالیکہ ہزاروں برس کے ہندو کلچر اور تہذیب پر آٹھ سو صفحات کی کتاب "آگ کا دریا" میں جو زورِ قلم صرف کیا ہے اور اس کو زندہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے وہ رجعت قہقری نہیں تو اور کیا ہے؟

جمیلہ شاہین صاحبہ نے افسوس ظاہر کیا کہ:-

"المناک بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی ہمارے
اکثر لکھنے والے مولوی نذیر احمد کی پیروی کر رہے
تھے"[1]

حسن عسکری صاحب کافی سمجھ دار آدمی ہیں اور ان کا قلم سکنڈ کی سوئی کی طرح مسلسل گھومتا رہتا ہے۔

انھوں نے ہی یہ بتایا کہ ادب میں بحران کی ابتدا ۱۹۵۴ء سے ہوئی اور ۱۹۵۸ء تک اس نے وبائی صورت اختیار کر کے پوری دنیا کے ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پاک و ہند کے سارے نقادوں کے نام کھلا خط لکھا کہ وہی کوشش کریں تو ادب کا یہ جمود ختم ہو سکتا ہے۔

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
ہندا اب کیا تھا۔ ع صلائے عام تھی، یارانِ نکتہ داں کے لئے

---

[1] ادب لطیف ۱۹۶۲ء۔

ترقی پسند ادب کے سوا کسی مکتبۂ فکر کے ادیبوں اور شاعروں کی خیر نہیں تھی سرسید سے لے کر حالی اور اکبر اور اس کے بعد تک کے کلام و بیان پر ایسی زبردست اور کڑی تنقیدیں ہوئی ہیں کہ ہر چہار جانب تنقیدی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک اور صاحب نے تجویز پیش کی کہ بحران کو ادب سے نکالنے کا واحد علاج یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لکھا جائے۔ چنانچہ ایک تعلیمی سروے رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ہماری لائبریریوں میں ۶۸ فی صد کتابیں غیر معیاری ہیں۔ عین اس وقت جب کہ ادب کے افق پر رات کے سیاہ تاریک سائے پھیلتے جا رہے تھے یا پھیلا دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ترقی پسندوں نے بحران اور انحطاط کی باتوں کو فراڈ قرار دیا۔ اور لکھا کہ۔

"یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی"۔

اور بہاریہ قصائد لکھ کر تکدر کی فضا کو یہ کہہ کر صاف کیا کہ:۔

"نقطۂ نظر کا جو تضاد ترقی پسندوں میں پایا جاتا ہے وہ تو محراب و ممبر والوں میں بھی نہیں پایا جاتا"[1]

ترقی پسند حلقے ہمیشہ اس امر پر شکوہ سنج رہتے ہیں کہ ان کے کلام و بیان کی ویسی پذیرائی نہیں ہوتی جس کا کہ وہ مستحق ہے سارے دانا۔ نے روزگار

---

[1] مظفر علی سید۔

Taj Tahir Foundation

اپنے شہ پاروں کا بوجھ اُٹھائے جہاں تہاں پڑے پھرتے ہیں۔ ہائے ناقدر شناس زمانہ کوئی نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ دورِ تجدد و اصلاح کا ناخدا جارج لکھتے ہیں:-

"اس بھرے شہر میں میں آرام کیسے پاؤں لڑکیا
کون سے گوشوں میں زیادہ ہوں گی نہ کروں بات
مگر پڑتو گنتا جاؤں"

یہ لوگ بتاتے ہیں کہ لکھنے کے لئے کسی اہم داخلی یا خارجی سانحہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور اگر محبت و اتفاق سے سب خیریت رہے تو ان کی تخلیقی قوتیں جوں کی توں بیکار پڑی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک مصنف صاحب جن کی کتاب پر انھیں آدم جی پرائز ملا ہے وہ ایک ماہ تک لاہور کے اسپتال میں نروس بریک ڈاؤن کے مرض میں مبتلا رہے۔ ان کا بیان ہے کہ صحت یاب ہو کر جب وہاں سے نکلے تو انھوں نے دو تاریخی کارنامے انجام دیئے اپنی اس کتاب کا پہلا باب لکھا اور دوسرے کسی سے محبت کی پینگ ہے آگ لینے جانا اور پیمبری کا مل جانا اسی کو کہتے ہیں۔

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation